انتخابِ غالب

یعنی نجم الدولہ دبیر الملک، میرزا اسداللہ خاں بہادر، نظام جنگ دہلوی
المتخلص بہ غالبؔ و اسدؔ کے کلامِ فارسی و اُردو کا انتخاب جسے خود مصنف نے
نواب خلد آشیاں کی فرمائش پر سنہ ۱۸۶۶ء میں مرتّب کیا

بہ تصحیح

امتیاز علی عرشی

ناظمِ کتاب خانہ

حسب الحکم فرماں روائے رامپور، دام اقبالہم و ملکہم

انتخابِ غالب

یعنی نجم الدولہ دبیر الملک، میرزا اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ دہلوی
المتخلص بہ غالبؔ و اسدؔ کے کلامِ فارسی و اُردو کا انتخاب جسے خود مصنف نے
نواب خلد آشیاں کی فرمائش پر سنہ ۱۸۶۶ء میں مرتّب کیا

به تصحیح

امتیاز علی عرشی

ناظمِ کتاب خانہ

حسب الحکم فرماں روائے رامپور، دام اقبالہم و ملکہم



انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر 1647

نام کتاب : انتخابِ غالب
اشاعتِ اوّل : 1942
اشاعتِ ثانی : 2021
تعداد : 2000

کمپوزنگ : عبدالرشید (انجمن ترقی اُردو ہند)
زیرِ اہتمام : امیرالحسن رحمانی
طباعت : اصیلا آفسٹ پرنٹرس، دریا گنج، نئی دہلی-110002

ISBN : 81-7160-150-2

Intekhab-i Ghalib

by Baidar Bakht

Edition : 2021

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
Ph. 011-23237722, E-mail: farouqui@yahoo.com
www.atuh.org

فہرست

~~~~~~
~~~~~~

حرفِ آغاز

غالب نے اپنی زندگی میں اپنی شاعری کے دو ذولسانی — اردو اور فارسی — انتخابات کیے تھے، ان میں سے ایک 'گلِ رعنا' ہے، جس کا ایک نسخہ مالک رام کو ان کے کسی مہربان نے دیا تھا اور جسے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ۱۹۷۰ میں دہلی سے شائع کیا گیا۔ اسی انتخاب کو ۱۹۶۹ میں سید وزیر حسن عابدی نے لاہور سے شائع کیا تھا۔ دوسرا انتخاب غالب نے نواب رامپور کے لیے کیا تھا، جو غالب کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ اس دوسرے انتخاب کو امتیاز علی عرشی نے تصحیح کے بعد ۱۹۴۲ میں شائع کیا۔ یہ انتخاب اب تقریباً نایاب ہے۔ اس کی ایک جلد ڈاکٹر بیدار بخت کے پاس ہے، جس کا عکس انھوں نے میری فرمائش پر انجمن ترقی اردو (ہند) کو عطا کیا۔ انجمن فخر و مباہات کے ساتھ اس انتخاب کو شائع کر رہی ہے۔ انجمن کو یہ کام کئی وجوہ سے کرنا چاہیے تھا۔ معرکہ آرا 'دیوانِ غالب' نسخۂ عرشی کی اشاعت بھی انجمن سے ہوئی تھی، اور اس پایے کا کوئی اور کام شاید ''دیوانِ غالب'' کے باب میں نہیں ہوا۔ یہ اس زمانے کا کام ہے جب عرشی صاحب جیسے لوگ پڑھنے لکھنے کے صرف وہی کام اہتمام سے کیا کرتے تھے جس میں تشہیر کا کوئی تصور نہ ہو۔ تعلقاتِ عامہ سے تو یہ بزرگ بہت دور تھے۔ رشید حسن خاں ایک ایک کتاب کی تدوین پر بیس بیس برس لگا دیتے تھے۔ امید کہ انجمن جلد ہی نسخۂ عرشی کی اشاعتِ مکرر کا اہتمام بھی کرے گی جو کم و بیش چالیس برسوں سے نایاب ہے۔ یہ انجمن سے ۱۹۷۱ میں شائع ہوا تھا مگر اب انجمن میں بھی اس کی ایک ہی کاپی ہے جس سے اسے دوبارہ کمپوز کرایا جا رہا ہے۔ اولین اشاعتیں کاتنے کی چھپائی کی ہیں، اور اب نہ تو اس اشاعت کا عکس چھاپنا ممکن ہے نہ ہی سخت محنت کے بغیر دوبارہ کمپوزنگ کے بعد اس کی پروف ریڈنگ کوئی آسان کام ہے۔

غالب کے انتخاب میں اعراب اور اوقاف اس لیے بھی نہ ہوں گے کہ اس زمانے میں اس کا دستور نہیں تھا۔ عرشی صاحب نے مگر 'انتخابِ غالب' میں نہ صرف اعراب لگائے ہیں بلکہ ایسے اوقاف بھی کثرت سے استعمال کیے ہیں جن کا علم شاید غالب کو بھی نہ ہو، مثلاً کولن (:) اور سیمی کولن (؛)۔ پہلے ہم نے بھی سوچا تھا کہ زیرِ نظر مجموعے میں اعراب اور اوقاف کا استعمال نہ کریں، مگر اس خیال سے کہ عرشی صاحب کی مرتب کی ہوئی کتاب تقریباً جوں کی توں پیش کی جائے،

ان کے لگائے ہوئے اعراب واوقاف من وعن رکھ لیے گئے ہیں۔ 'تقریباً' اس لیے کہ املا میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں کردی گئی ہیں، جو سب رشید حسن خاں کی ہدایت کے بموجب ہیں۔ یہ تبدیلیاں بیدار بخت نے کی ہیں:

۱- پرانے زمانے کی روشِ کتابت کے مطابق عرشی صاحب نے یاے مجہول (ے) اور یاے معروف (ی) میں فرق نہیں کیا تھا، خاص طور سے فارسی اشعار میں۔ خود غالب نے بھی ایک خط میں لکھا تھا کہ 'اے کریے' کو یاے معروف سے لکھنا غلط ہے۔ اشعار کی املا اسی حساب سے جن الفاظ میں یاے مجہول ہونا چاہیے وہاں عرشی صاحب کی املا بدل دی گئی ہے۔ رشید حسن خاں صاحب گفتگو میں 'املا' کو موئنث اور مذکر دونوں طرح استعمال کرتے تھے۔

۲- اسی طرح پرانی روش کتابت کے مطابق خود غالب بھی نون غنہ کو نقطے کے ساتھ لکھتے تھے مگر مانتے تھے کہ جدید ایرانی لہجے کے برخلاف ہندستانی ایرانی میں نون غنہ کی آواز ہے۔ عرشی صاحب نے بھی پرانی روشِ تحریر کے مطابق نون غنہ میں نقطے کا استعمال کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں نون غنہ میں نقطوں کو ہٹا دیا گیا ہے۔

۳- غالب نے بھی، اور عرشی صاحب نے بھی، الف کے بعد پیش کو ظاہر کرنے کے لیے واو بھی لکھا ہے، جیسے 'اُس' کو 'اوس' لکھا ہے۔ ایسے لفظوں میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے۔

۴- عرشی صاحب نے کئی جگہ پرانے دستور کے مطابق لفظوں کو ملا کر لکھا ہے، مثلاً ناتوانیہاست۔ ایسے ملا کر لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے، لہٰذا ایسے مرکب الفاظ کو الگ الگ لکھ دیا گیا ہے، جیسے اوپر دی گئی مثال کو 'ناتوانی ہاست' لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کو اردو ٹائپ کے مشہور کمپیوٹر پروگرام InPage میں ٹائپ کیا گیا ہے۔ اس اچھے پروگرام میں ایک نقص یہ ہے کہ جب ک ی ج ے ملا کر نستعلیق میں لکھے جائیں تو ی اور ج کے نقطے ایک ساتھ مل جاتے ہیں اور لفظ کی شکل 'کیجے' بن جاتی ہے۔ ہاں اگر یہی لفظ نسخ میں لکھا جائے تو 'کیجے' بن جاتا ہے جو درست ہے۔ اس مجبوری کے سبب اس لفظ کو نسخ میں ٹائپ کیا گیا ہے۔

امید کہ اردو کی علمی دنیا میں عاشقانِ غالب، شائقینِ غالب اور ماہرینِ غالب میں اس انتخاب کی پذیرائی ہوگی۔

دسمبر ۲۰۲۰ — اطہر فاروقی

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

تقریب

نواب خلد آشیاں (طابَ ثراہ) نے، فارسی و اُردو کے چیدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں، میرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے فرمائش کی کہ اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ارسال کر دیجیے، تاکہ اُسے شاملِ بیاض کر لیا جائے۔ ستمبر ۱۸۶۶ء میں، میرزا صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل کی، اور یکے بعدِ دیگرے کلیاتِ اُردو و فارسی کے خود کردہ انتخابات جداگانہ کتابی صورت میں نقل کرا کے، نواب خلد آشیاں کے حضور میں ڈاک کے توسط سے پیش کیے۔

سرکار کے ملاحظے کے بعد، یہ دونوں نسخے کتاب خانے کو بھیج دیے گئے۔ اُس عہد کے منتظمینِ کتاب خانہ نے، صرف فارسی انتخاب کو شعبۂ دواوین میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا، اور رسمِ زمانہ کے مطابق، انتخابِ اُردو کو ناقابلِ التفات خیال کر کے، کتاب خانے کے ''ردی گھر'' میں گمنامی کی گہری نیند سلا کر مطمئن ہو گئے۔ حسنِ اتفاق سے، مولوی امتیاز علی خاں عرشیؔ، ناظمِ کتاب خانہ نے ''ردی گھر'' کی متاعِ کاسد کا جائزہ لیتے ہوئے دوسرے نوادرات کے ساتھ اردو انتخاب بھی برآمد کر لیا، اور میرزا صاحب کی تھکی ہوئی زندگی کا یہ کارنامہ، ملک کے اربابِ ذوق کے لیے محفوظ ہو گیا۔

گو میرزا صاحب اپنا اردو اور فارسی دیوان خود شائع کر چکے تھے؛ لیکن اُنھیں اپنی فارسی فارسی زبان کی محنت پژوہی اور جگر کاوی پر زیادہ ناز تھا، حتیٰ کہ ایک معاصرانہ طعن کے جواب میں یہ کہہ اُٹھے تھے:

فارسی بیں، تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　　بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ منست

میرزا صاحب کا یہ ادّعا بے بنیاد نہیں تھا؛ اسی لیے خواجہ حالی مرحوم نے ''یادگارِ غالب'' میں فارسی کلام کے محاسن زیادہ اجاگر کیے، مگر ملک میں اردو زبان کے پیہم عروج نے، جس کے اثر سے خود خواجہ صاحب بھی بہ خوبی آگاہ تھے، اہلِ ادب کی توجہ دیوانِ اُردو کی طرف منعطف کی، اور رفتہ رفتہ غالب پسندی اس درجے تک پہنچ گئی کہ ہندستان نے ''مرقعِ چغتائی'' جیسے گراں قیمت نسخے کو بھی ہاتھوں ہاتھ خرید لیا۔

اگر بہ غور دیکھا جائے تو اُردو کلام کے مقابلے میں فارسی کی نامقبولیت کے اندر، پسِ پردہ یہ حقیقت بھی کام کر رہی تھی کہ میرزا صاحب نے اُردو دیوان کی طرح اپنے فارسی اشعار کا کوئی منتخب مجموعہ اہلِ ذوق کے سامنے نہیں رکھا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے فارسی اشعار کے بے بہا موتی کم قیمت جواہرات کے انبار میں پوشیدہ پڑے رہے۔ خوش بختی سے، کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں زیرِ نظر انتخاب کے دستیاب ہو جانے سے، جو میرزا صاحب کے ادوارِ عمر میں سے پختہ تر دور کا کارنامہ ہے، یہ کمی بہ خوبی پوری ہو گئی۔ اس لیے بعید نہیں کہ انتخاب سے سخن سنجوں پر میرزا صاحب کی فارسی شعر گوئی کے مخفی جوہر کھل جائیں، اور اس طرح اُن کی وہ آرزو، جواب تک شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی تھی، اس کی بدولت بر آئے۔

پرورشِ علم و ادب کے موروثی جذبے، نیز اس انتخاب کی ادبی اہمیت کی بنا پر، بندگانِ حضورِ پُرنور، میجر ہز ہائنس عالی جاہ، فرزندِ دل پذیرِ دولتِ انگلشیہ، مخلص الدولہ، ناصر الملک، امیر الامرا، نواب سر سیّد محمد رضا علی خاں بہادر، مستعد جنگ، کے. سی. ایس. آئی، ایل. ایل. ڈی، ڈی. لٹ، فرماں روائے ریاستِ عالیۂ رامپور، دام اقبالہم و ملکم کی ہمایوں توجہ اس کی اشاعت کی طرف مبذول ہوئی۔

عرشی صاحب نے ''مکاتیبِ غالب'' کی ترتیب میں جس حسنِ کار اور خوش سلیقگی کا ثبوت دیا تھا، ملک کے مستند ادیب اور نقاد خوش آیند الفاظ میں اُس کا اظہار کر چکے تھے۔ بنابریں ''انتخابِ غالب'' کی تصحیح و ترتیب کا کام بھی زیرِ نگرانیِ عالی مرتبت صاحبزادہ عبدالجلیل خاں بہادر، ہوم منسٹر، انھیں کے سپرد کیا گیا۔ ان کی چند سال کی دیدہ ریزی اور کوشش کے بعد یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کی بدولت بندگانِ ہمایوں کی بارگاہِ معلّیٰ میں پیش کیا جائے۔

التجا ہے کہ اعلیٰ حضرت اس حقیر ادبی کوشش کو طغرائے قبول سے مزین و مفتخر فرمائیں، اور دعا ہے کہ سرکار کے زیرِ سایہ اس قسم کی بے شمار کوششیں بار آور ہوں!

سکریٹری ایٹ، رامپور
۱۰ دسمبر ۱۹۴۱ء

دوامِ دولت و اقبال کا داعی
بشیر حسین زیدی
چیف منسٹر

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

دیباچہ

اُردو شاعری نے اپنی چھوٹی سی عمر میں جس قدر ترقی کی، مشرقی شعروسخن کی دُنیا میں اُس کی نظیر تلاش کرنا بیکار ہے۔ خالص عاشقانہ چھیڑ سے اعلیٰ صوفیانہ جذبات تک اور انتہائی سادگی سے الفاظ و معانی کے حوصلہ فرسا اغلاق و پیچیدگی تک، کوئی ایسا اندازِ بیان اور طرزِ تخیل نہیں، جو ہندی سخنوروں کے دسترس سے باہر رہا ہے۔

بیشک عربی شعر کی معنوی خصوصیت اُردو میں شاذونادر ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ عربی داں بزرگوں میں شاعرانہ خیالات کے بیباک اظہار کی جرأت نہ تھی، اور غیر عربی داں شاعر سُنی سُنائی باتوں سے ماہرانہ کام نہیں لے سکتا تھا، لیکن فارسی ادب کی ہزار سالہ شکست و ریخت کا نتیجہ: سعدیؔ کی سادگی، حافظ کا ولولہ و جوش، خسروؔ اور حسن سنجری کا معاملہ، جامیؔ کا تصوف، فغانیؔ و نظیریؔ و عرفیؔ کی پُرکاری اور شوکتؔ و اسیرؔ و بیدلؔ کی بوسہ بہ پیغامی، اُردو شاعری میں دوڈھائی سو سال کے اندر ہی اُجاگر ہوچکی ہے، اور آج ہر کافرِ ادب بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ:

مشو منکر، کہ در اشعارِ ایں قوم
ورائے شاعری، ''چیزے دگر'' ہست

سوال یہ ہے کہ اتنی کم مدت میں اس قدر عظیم الشان سرمایۂ ادب کس طرح جمع ہوگیا؟

اگر اُردو شعاری کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ابتدا سے دو قسم کے شاعر نظر آئیں گے: ایک جماعت ایسی دکھائی دے گی، جو بیرونی علوم و آداب سے برائے نام واقف تھی اور دوسری جماعت ایسی ملے گی، جسے عربی و فارسی میں سے دونوں کے اندر، یا علی الاقل صرف فارسی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان گروہوں میں سے اول الذکر کی تعداد اب سے چالیس پچاس سال اُدھر تک بہت کم تھی؛ کیوں کہ انگریزی زبان کے تسلّط و اقتدار سے پہلے، تعلیم کا ادنیٰ معیار فارسی دانی تھی۔ چوں کہ فارسی زبان کا بڑا سرمایہ اُس کی شاعری ہے اور ہر ایک فارسی پڑھنے والے کو اس زبان کے چیدہ شاعروں کا بہترین کلام نصاب میں پڑھایا جاتا تھا، اس امر کے پیشِ نظر غور کیجیے کہ ایک طالبِ علم نے ''پند نامۂ'' سعدی سے شروع کر کے، ''سکندر نامۂ'' نظامی یا ''شاہ نامۂ'' فردوسی تک، مثنوی، غزل اور قصیدے کے کئی ہزار شعر سبقاً سبقاً پڑھے اور

روزانہ مطالعہ و بحث کے دوران میں اُن پر غور و فکر کی، تو کیا سات آٹھ برس کی مسلسل ادبی جدوجہد نے بساطِ ادب کے ان تازہ واردوں کے سوئے ہوئے جذبۂ شعر کو بیدار نہ کیا ہوگا؟ اور کیا یہ نیم رس گروہ، تعلیم سے فراغت کے بعد، اپنے دماغ کے نرم و نازک پردوں سے اس پُرسوز و ساز صنفِ کلام کے نقوش مٹانے میں کامیاب ہوسکا ہوگا؟ عملاً اس امر کے محال ہونے کی وجہ سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان میں فارسی شعر گوئی کی تحریک اور اُس کی حیرت انگیز ترقی میں نصابِ تعلیم کو بڑا دخل رہا ہے، اور خالص ہندوستانی اہلِ ذوق کی فارسی زبان میں سخن گستری کا راز یہ ہے کہ اُنھوں نے دورانِ تعلیم میں سب سے زیادہ اسی صنفِ کلام کا مطالعہ کیا اور اس لیے اسی دریا کے اُتار چڑھاؤ سے اُنھیں زیادہ آگہی حاصل تھی؛ حتیٰ کہ بسا اوقات ملکی ماحول کی معمولی جھلک بھی اُن کے کلام میں نظر نہیں آتی تھی۔

ایجاد و ترقیِ ریختہ

لیکن ہندوستان میں، فارسی شعر گوئی کے آغاز ہی سے، مسعودِ سعدِ سلمان لاہوری اور امیر خسروؔ دہلوی کی طرح، ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے والے شاعر موجود تھے۔ ان جداگانہ راہوں کی گلگشت سے طبیعت سیر ہوگئی، اور ذوقِ شعر کو نئی راہ کی تلاش کا خیال پیدا ہوا، تو جدّت پسند دماغوں نے فارسی عروض اور قافیے کی پابندی کے ساتھ، دیسی روزمرہ میں ایک نئی روش کی بنا ڈالی اور اُس کا نام ''ریختہ'' رکھا۔ اس مشغلے نے، جو آغاز میں صرف دل کا بہلاوا تھا، انجام میں ایسے شاعر بھی پیدا کیے، جو اسے سنجیدگی کی نظر سے دیکھتے اور فارسی کے ساتھ اس میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ بدیسی شعر گوئی کا رواج گھٹتا گیا اور ہندوستان کے ذوقِ شعر کا انحصار صرف شعرِ ریختہ پر رہ گیا۔

چوں کہ ابتدائی ریختہ گو، فارسی کے بھی سخنور یا تعلیم یافتہ تھے اور اُن کے پیشِ نظر اس زبان کے ہر دور کے استادوں کا کلام رہتا تھا، اس لیے ریختہ کہتے وقت اُن کے دماغ نے وہی خیال زبان کے سپرد کیا، جو بدیسی زبان میں بارہا پڑھا اور کہا تھا، اور جس کی چمک دمک سے اُن کے دماغ کا گوشہ گوشہ روشن ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف مذاق کے شاعروں کی لگاتار کوشش سے، فارسی کی ہزار سالہ ترقی کے تمام اثرات ریختہ میں پیدا ہوگئے۔ میرے نزدیک یہ وجہ ہے اُردو شعر و سخن کی کم عمری میں زیادہ ترقی کرنے کی اور اسی پر میں اپنے اس خیال کی بنیاد

رکھتا ہوں کہ اُردو شاعروں میں جو اچھا فارسی گو تھا، وہی اُردو میں بھی بلند پایہ اور عالی رُتبہ مانا گیا اور فارسی گوئی کے درجوں کے تفاوت کے اعتبار سے اُردو شعر و سخن کی خوبی و برتری کے درجات بھی ہمیشہ متفاوت رہے ہیں۔ چناں چہ میرے نزدیک خواجہ میر دردؔ، میرزا رفیع السوداؔ، میر تقی میرؔ، مفتی صدر الدین خاں آزردہؔ، حکیم مومن خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ اور خود میرزا غالبؔ کی بلندیِ ذوقِ سخن کا یہی راز ہے اور یہی وجہ ہے ہمارے زمانے کے دو سب سے بڑے شاعروں: خواجہ الطاف حسین حالیؔ اور علامہ اقبالؔ مرحوم کی برتری اور سربلندی کی۔

غالبؔ کا دعویٰ

آج میرزا غالبؔ کو اُردو شاعروں کی پہلی صف کا رہنما تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن وہ خود، کلامِ ریختہ کو اپنے لیے موجبِ ننگ اور فارسی کو باعثِ فخر خیال کرتے تھے۔ چناں چہ ایک قطعے میں فرماتے ہیں:

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ !
"کے بہ پُر گوئی، فلاں در شعر ہم سنگِ منست ؟"
راست گفتی، لیک میدانے کہ نبود جاے طعن
کمتر از بانگِ دہل، گر، نغمۂ چنگِ منست
نیست نقصاں، یک دو جزو ست، ار، سوادِ ریختہ
فارسی بیں، تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو، کہ بیرنگِ منست
فارسی بیں، تا بہ بینی، کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم ، آں مجموعہ ار تنگِ منست

اس خیال میں اُنھیں اس درجہ غلو پیدا ہو گیا تھا، کہ اپنے کلیاتِ فارسی کو الہامی صحیفہ اور ایزدی کتاب قرار دیتے تھے۔ چناں چہ جب ۴۱ برس کی عمر میں اُس کی ترتیب سے فارغ ہوئے، تو خاتمے میں اس نغمے پر تان توڑی تھی:

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے
غالب، اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

ممکن ہے، موجودہ عہد میں، جب کہ فارسی شعر و سخن کی محفل اُجڑ چکی ہے اور اس آتشِ بے درد کے شعلے ٹھنڈے پڑ چکے ہیں، اُن کا دعویٰ تسلیم نہ کیا جائے؛ لیکن میرزا صاحب کے معاصر نکتہ سنج، اسے بے چون و چرا مانتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، جو اُن کے دوستوں میں بڑے بلند رُتبہ سخنور اور قابلِ استناد سخن سنج تھے، اور جن کے متعلق اُنھوں نے ایک مطقع میں اعتراف کیا ہے کہ:

غالب، بفنِ گفتگو، نازد بدیں ارزش، کہ او
ننوشت در دیوان غزل، تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

''گلشنِ بے خار'' میں لکھتے ہیں:[1]

''در زبانِ فارسی نیز دستگاہی بلند و مایۂ وافر بہم رسانیدہ، پایہ اش از فحولِ استاداں کم نیست۔ غزلش، چوں غزلِ نظیری، بے نظیر و قصیدہ اش، چوں قصیدۂ عرفی، دل پذیر... بالجملہ چنیں نکتہ سنجِ نغز گفتار کمتر مرئی شدہ''۔

خواجہ حالی مرحوم، جو میرزا صاحب کے مایۂ ناز شاگرد اور بڑے نکتہ رس نقاد تھے، فرماتے ہیں:[2]

''وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے، اور اُس کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں''۔

خود میرزا صاحب نے بھی اِس کا اعتراف کیا ہے کہ اُن کے کلامِ اُردو کی شمع نے فارسی ذوق سے کسبِ ضو کیا ہے۔ چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں:[3]

''قبلہ! ابتدائی فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چناں چہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا　　　اسداللہ خاں، قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی، تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے''۔

یہ قوتِ تمیزی، خود میرزا صاحب کے ارشاد کے مطابق اساتذۂ فارسی کے دواوین کے مطالعے کا نتیجہ تھی۔ چناں چہ کلیاتِ فارسی کے خاتمے میں فرماتے ہیں:[4]

''شیخ علی حزیں، بخندۂ زیر لبی، بے راہہ رویہاے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت،
وزہرِ نگاہِ طالبِ آملی، و برقِ چشمِ عرفیِ شیرازی، مادۂ ہرزہ جنبشہاے نارو ادر
پاے رہ پیماے من بسوخت۔ ظہوری، بسرگرمیِ گیرائیِ نفس، حرزے
ببازوے وتوشۂ بکمرم بست، ونظیریِ لاابالی خرام، بہنجارِ خاصۂ خودم، بچالش
آورد۔ اکنوں بیمنِ فرہ پرورشِ آموختگیِ ایں گروہِ فرشتہ شکوہ، کلکِ رقاصِ من
بخرامش تدرواست و برامش موسیقار، بجلوہ طاؤس ست و بپرواز عنقا''۔

عہدِ حاضر میں میرزا صاحب کی شہرت و ناموری کا تمام تر مدار اُن کے دیوانِ ریختہ پر ہے، لیکن یہ اُن کے اصل دیوان کا انتخاب ہے۔ خوش بختی سے یہ دیوان بھی ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے ریاستِ بھوپال کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ سخنورانِ کامل اس کے اشعار سن کر آسان کہنے کی فرمائش ضرور کرتے ہوں گے؛ ورنہ میرزا صاحب اس کا انتخاب کبھی نہ کرتے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرزا صاحب کی موجودہ شہرت کا مدار اس قدیم دیوان کے طلسمی اشعار ہیں۔ منتخب دیوانِ ریختہ کے دیباچے سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، اس لیے کہ میرزا صاحب نے اُس میں علی الاعلان کہہ دیا ہے کہ:

''امید کہ سخن سرایانِ سخنور ستاے، پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازیں اوراق یابند،
از آثارِ تراوشِ رگِ کلکِ ایں نامہ سیاہ نشناسند، ممنون و ماخوذ نسگالند''۔[۵]

تو کیا پھر وہ دس پندرہ شعر اُن کی برتری کا موجب ہوئے، جو دیوانِ حال میں نمونے کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے؟ لیکن یہ عقیدہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ شیفتہ و حالی جیسے نقادانِ فن سے عرشی جیسے کم سواد تک، کوئی سخن فہم یہ یقین نہیں رکھتا کہ غالب کی فنی شخصیت کا ظہور:

نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب
پاے طاؤس پےِ خامۂ مانی مانگے

یا اسی قبیل کے دوسرے اشعار میں ہوا ہے۔ اس کے برخلاف ہر شخص کی راے ہے کہ غالب ان جیسے اشعار میں جلوہ گر ہے:

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی، اے چارہ گر، نہیں آتی؟
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اور یہ سب شعر اُس زمانے کے کہے ہوئے ہیں، جب اُن کا فارسی ذوق پختہ ہو چکا تھا اور وہ اپنے اُردو کلام کے متعلق، جسے قبل ازیں، ''نخلستانِ فرہنگ'' کا ''برگِ دژم'' قرار دے چکے تھے، یہ کہہ دینے پر مجبور ہوئے تھے کہ:

جو یہ کہے کہ ''ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی؟''
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

انتخابِ اشعار

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا، میرزا صاحب نے اپنے ابتدائی اُردو کلام کو ۲۵ سال کی عمر کے بعد خود منتخب کر کے ایک دو جزو کا چھوٹا سا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اس کے بعد میرزا صاحب ہمہ تن فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے، اور ۱۸۵۰ء تک اسی شیوے کو نباہتے رہے۔ قلعۂ معلّٰی کے تعلق نے ان کی توجہ پھر ریختے کی طرف منعطف کی اور ذوقؔ کے انتقال پر استادِ شاہ کا اعزاز پانے کے بعد تقریباً اُردو ہی میں کہنے لگے۔ اس زمانے میں دلّی اور باہر کے بہت سے شاعروں نے اپنا اُردو کلام اصلاح کے لیے بھیجنا شروع کیا، جس کے باعث سے اس روش کی ساخت و پرداخت میں زیادہ وقت گزرنے لگا۔ تا آں کہ سنہ ۱۸۵۷ء تک اتنا بڑا دیوان تیار ہو گیا، جس کا حجم ابتدائی دیوان کے انتخاب کے تقریباً برابر تھا۔ اس کے بعد میرزا صاحب کی شاعرانہ زندگی کی تخلیقی حرکت بڑی حد تک ختم ہو گئی۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی شاعر کا بھی سب کلام یکساں حیثیت کا نہیں ہوتا۔ شاعر کی زندگی کے تمام داخلی و خارجی عوامل، جو رفتارِ عمر کے ساتھ پیہم تغیر پذیر رہتے ہیں، شعر کے الفاظ اور معانی دونوں پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں اور اس لیے پختگیِ عمر کے ہر نئے مرحلے میں، سابق نشان ہائے قدم پر انتقادی نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرزا صاحب کا آخری اُردو کلام بھی اس کلیّے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا تھا۔

علاوہ ازیں، اُن کا فارسی دیوان صرف ایک بار ''گلِ رعنا'' کی صورت میں شرمندۂ انتخاب ہوا تھا۔ اولاً تو اُس کے نسخے عام طور پر شائع نہ ہوئے، اس لیے اُس کے معیارِ انتخاب کا تعیّن دشوار ہے[۶]۔ ثانیاً وہ خود میرزا صاحب کی اُس عمر کا کام ہے جب کہ وہ بادۂ نیم رس کی حیثیت رکھتے تھے اور ابھی اُن کے لیے ودیعت خانۂ غیب میں اشعارِ فارسی کی خاصی تعداد محفوظ تھی۔ ان وجوہ سے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام پر شاعر کی آخری نظرِ انتخاب کی ضرورت باقی تھی۔

آخری انتخاب

حسنِ اتفاق سے، نواب خلد آشیاں نے اساتذۂ اُردو و فارسی کے منتخب اشعار کی ایک بیاض ترتیب دینے کا عزم فرمایا۔ اِس موقعے پر سرکار کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ میرزا صاحب کے کلام کا انتخاب خود اُنھیں سے کرایا جائے۔ ۲۵ / اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو سرکار نے میرزا صاحب کو تحریر فرمایا:[۷]

''مطلبِ دگر، جو کہ راقم کو ترتیب بیاضِ اشعارِ منتخبۂ اساتذۂ پارسی واُردو کی منظور ہے، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوانِ فارسی اور اُردو اپنے کا فرما کر، مع انتخابِ کلامِ ضیاءالدین خاں صاحب، لطف کریں، تا شامل انتخاب کے، جو اس سرکار میں عمل میں آیا ہے، ہو جائے''۔

میرزا صاحب نے ۱۸ / ستمبر کو دیوانِ اُردو اور ۲۴ / ستمبر کو دیوانِ فارسی کا انتخاب ارسال کر دیا۔[۸]

اردو انتخاب

اُردو انتخاب 7¾X12¼ انچ ناپ کے ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان صفحوں کی سطروں کی تعداد مختلف ہے۔ کہیں ۱۳ اور کہیں اس سے زیادہ ۱۶ تک ہیں۔ کاغذ یورپ کی ساخت کا باریک ہے۔ متن کی روشنائی سیاہ اور عنوانات سرخ ہیں۔ قلم اول سے آخر تک ایک ہے۔ خط بہت معمولی نستعلیق اور اس قدر اغلاط سے پُر ہے کہ میرزا صاحب کی تصحیح کے باوجود باقی ماندہ غلطیاں اصلاحوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ ہر نئی غزل کے پہلے مصرعے کے شروع میں سرخ لکیر کھینچی گئی ہے، تاکہ سابق و لاحق میں امتیاز پیدا ہو جائے۔ ۴۸ صفحوں تک کسی نے صفحہ شماری بھی کی ہے۔ عرصۂ دراز تک ''ردی گھر'' میں پڑا رہنے کے باوجود اوراق میں بہت معمولی سی کرم خوردگی اور کسی قدر کہنگی پیدا ہوئی ہے۔

صفحات ۶، ۱۲، ۱۴، ۱۷، ۲۲، ۲۷، ۳۱، ۳۴، ۳۶، ۳۸، ۴۸، ۴۹، ۵۴، ۵۸، ۶۳، ۶۴ پر میرزا صاحب کے قلم کی لفظی اصلاحیں پائی جاتی ہیں، جن میں غلط املے کی تصحیح اور ساقط الفاظ کا اضافہ دونوں شامل ہیں۔

قرائن سے پتا چلتا ہے کہ میرزا صاحب نے مطبعِ نظامی کانپور کے چھپے ہوئے نسخے پر صاد بنا کر کاتب سے شعر نقل کرائے ہیں۔ اس لیے کہ:

(۱) دہلی اور آگرے کے مطبوعہ نسخوں میں ''کیوں کر اُس بت سے رکھوں جان عزیز'' والی غزل نہیں ہے، مگر نظامی ایڈیشن اور ہمارے انتخاب دونوں میں موجود ہے۔

(۲) میرزا صاحب کا یہ شعر:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

میرزا صاحب کی زندگی میں چھپے ہوئے یا لکھے ہوئے تمام نسخوں کے برخلاف صرف نظامی ایڈیشن میں اس طرح کاتب نے مسخ کیا تھا: گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری خوشامد سے، الخ۔ ہمارے انتخاب میں بھی کاتب نے اس مصرعے کو یوں ہی لکھا ہے، جو سؤے اتفاق سے میرزا صاحب کی نظرِ تصحیح سے بچ بھی گیا ہے۔

(۳) میرزا صاحب کی ایک رباعی کا مصرع دہلی اور آگرے کے ایڈیشنوں میں اس طرح ہے:

یعنی ہر بار کاغذِ باد کی طرح

میرزا صاحب نے دہلوی نسخے کے غلط نامے میں ایک اور مصرعے کے اندر لفظ ''طرح'' بہ سکونِ اوسط کے استعمال سے بچنے کی غرض سے اُس مصرعے کی تصحیح کی تھی۔ وہ مصرع پہلے یوں تھا:

دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غلط نامے کے اندر میرزا صاحب نے لکھا:

صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

مگر یہی لفظ مذکورۂ بالا رباعی کے اندر بہ سکونِ اوسط بندھا تھا، جو غالباً از راہِ سہو غلط نامے میں بھی بار نہ پاسکا۔ نظامی ایڈیشن اور ہمارے انتخاب میں اس کے اندر بھی تغیر کر دیا گیا ہے اور ان دونوں میں یہ مصرع اس طرح تحریر ہوا ہے:

یعنی: ہر بار صورتِ کاغذِ باد

(۴) میرزا صاحب کی زندگی کے تمام مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے برخلاف نظامی ایڈیشن میں چھپا تھا:

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال

انتخاب کے کاتب نے بھی اسی طرح نقل کر دیا تھا۔ میرزا صاحب نے تصحیح کرتے وقت

دوسرے مصرعے میں ''عنایات'' کی جگہ ''عنایت'' اپنے قلم سے بنایا ہے۔

ان مواقع کے ماسوا بھی انتخاب کا متن نظامی ایڈیشن کے متن کے مطابق ہے۔

مقدارِ انتخاب

نظامی ایڈیشن کے ابیات کی مجموعی تعداد ۱۷۹۹ ہے، جن میں ۱۴۵۷ غزلوں کے، ۱۶۲ قصائد کے، ۳۲ رباعیوں کے، اور باقی ۲۵ ''مثنویِ انبہ'' کے ہیں۔

انتخاب میں مثنوی مکمل چن لی گئی ہے، بقیہ اصناف میں سے غزلوں کے ۶۷۳، قصیدوں کے ۹۲، قطعات کے ۴۰ اور رباعیوں کے ۱۰ اشعر انتخاب کیے گئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۸۴۸ ہوتی ہے۔

فارسی انتخاب

فارسی انتخاب 11½ X 7½ انچ کی ناپ کے ۸۳ صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کا مسطر ۱۷ سطری ہے، لیکن ہر غزل کے ختم پر دوسری کے عنوان کے خیال سے ایک سطر سادہ چھوڑ دی گئی ہے۔ روشنائی اور کاغذ اردو انتخاب کا جیسا ہے۔ اندازِ تحریر کے معائنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تین کاتبوں نے مل کر اسے نقل کیا ہے۔ چناں چہ ص ۱-۴ ایک شخص کا خط ہے۔ اس کے بعد ۵-۹ خود میرزا صاحب کا قلم ہے اور پھر ۱۰-۱۴ پہلے کاتب کا، اور ۱۵ تا آخر تیسرے شخص کا ہے۔

اس حصے کی نقل میں بھی کاتبوں نے غلطیاں کی تھیں، جن میں بہت سی میرزا صاحب نے اپنے قلم سے درست کر دی ہیں[9]۔ بقیہ میں سے اہم کا ذکر اختلافِ نسخ میں کیا گیا ہے۔

غالباً اس انتخاب کی بنیاد کلیاتِ فارسی کے نول کشوری ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۶۳ء پر رکھی گئی ہے، کیوں کہ طرزِ کتابت کی یکسانی کے ماسوا، ہمارے انتخاب کی آٹھویں رباعی صرف اسی نسخے میں موجود ہے۔ البتہ انتخاب کا یہ شعر:

عبودیت نکند اقتضاے خواہشِ کام   دعا بصیغۂ امر است و امر بے ادبیست

کلیات میں نہیں پایا جاتا۔ یہ پہلی بار ''سبدچین'' میں شائع ہوا تھا؛ میرزا صاحب نے اُسی سے مطبوعہ نسخے میں لکھ لیا ہوگا۔

مقدارِ انتخاب

فارسی کلیات کا انتخاب غزلوں اور رباعیوں تک محدود ہے۔ مذکورۂ بالا مطبوعہ نسخے میں

غزلوں کے اشعار کی تعداد ۳۶۰۶ اور رباعیات کی تعداد ۲۰۸ ہے۔ ان میں سے ۱۰۶۰ غزلوں کے شعر اور ۱۸ رباعیاں انتخاب کی گئی ہیں۔ چناں چہ اوپر لکھے ہوئے ایک شعر کو شامل کر لینے کے بعد منتخب اشعار کی مجموعی تعداد ۱۰۹۷ ہوتی ہیو۔

معیارِ انتخاب

اس انتخاب کی ترتیب کے وقت، میرزا صاحب کے پیشِ نظر جو معیار تھا "مکاتیبِ غالب" میں اُس کی تصریح نہیں ملتی؛ مگر میرزا صاحب کی دوسری تحریروں کی مدد سے، شعر وسخن کے متعلق اُن کے عام نقطۂ نگاہ، اور اُس کی تدریجی ترقی واصلاح کا تعین ممکن ہے۔ چوں کہ اُن کی آخری عمر کے مذاقِ سخن ہی پر اس انتخاب کے حسن وقبح کا مدار ہے، اور اُسی کے اجزا کی تعیین سے معیارِ انتخاب کے جزئیات طے کیے جا سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے مذکورہ بالا اُردو، فارسی تحریروں کو مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔

تعریفِ سخن

شعر وسخن کو میرزا صاحب نے "گراں ارز متاعِ عالم قدس"[۱۰] قرار دیا ہے، اور اُس کی ادبی تحدید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "سخن ایک معشوقۂ پری پیکر ہے۔ تقطیعِ شعر اُس کا لباس اور مضامین اُس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں رو کشِ ماہِ تمام پایا ہے"۔[۱۱]

اس شاہد کے حسن کی نیرنگی اور اُس کے دیدہ وروں کے ذوق کی بوقلمونی کے متعلق فرماتے ہیں:

> "گفتارِ موزوں، کہ آں را شعر نامند، در ہر دل جائے دیگر، و در ہر دیدہ رنگے دیگر، و سخن سرایاں را ہر زخمہ جنبشے دیگر، و ہر ساز آہنگی دیگر دارد"۔[۱۲]

لفظیت ومعنویت

"گفتارِ موزوں" کے دو پہلو ہیں: لفظی اور معنوی۔ میرزا صاحب ابتدا میں صرف معنوی پہلو پر زور دیتے تھے، اور لفظی محاسن کی طرف سے بالکل بے توجہ تھے۔ نسخۂ حمیدیہ کے اشعار کے علاوہ، خود ایک خط میں اُنھوں نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ "شاعری معنی آفرینی ہے"۔[۱۳] اپنے متعلق اعتراف کرتے ہیں کہ:

''نہ آبلہ پائے جادۂ صنائعم، ونہ گوہر آمائے رشتۂ بدائع۔ کبابِ گرمی، آتشِ بیدودِ پارسیم، وخرابِ تلخیِ بادۂ پُر زورِ معنی'' [۱۴]

میجر جان جاکوب کو بھی یہی لکھا ہے کہ:

''سوگند کہ ہیچ گاہ دل بفنِ تاریخ و معما نہ نہادہ ام، وصنعتِ الفاظ را بر معنی نگزیدہ'' [۱۵]

میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

''کیا ہنسی آتی ہے، کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اُس کے قوافی لکھ لیے اور اُن قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولاقوۃ الاباللہ!

بچپن میں جب میں ریختہ کہنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر، اگر میں نے کوئی ریختہ یا اُس کے قوافی پیشِ نظر رکھ لیے ہوں! صرف بحر اور ردیف، قافیہ دیکھ لیا، اور اُس زمین میں غزل، قصیدہ لکھنے لگا'' [۱۶]

ایک بار شیونرائن کو کسی قدر ترش لہجے میں لکھا ہے:

''بھائی، حاشا ثم حاشا! اگر یہ غزل میری ہو:

اسد اور لینے کے دینے پڑے

اُس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں؟ لیکن اگر یہ غزل میری ہو، تو مجھ پر ہزار لعنت!

اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ 'قبلہ! آپ نے کیا خوب مطلع ہے:

اسد، اس جفا پر بتوں سے وفا کی   مرے شیر، شاباش، رحمت خدا کی'!

میں نے یہی اُن سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو، تو مجھ پر لعنت!...

تم طرزِ تحریر اور روشِ فکر پر بھی نظر نہیں کرتے؟ میرا کلام اور ایسا مُزخرف!'' [۱۷]

اتفاقاً اُنھیں ایام میں جنون بریلوی نے کسی غزل کی ردیف اور قافیے کا حوالہ دے کر، پوری غزل مانگی تھی۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے شیونرائن کے نام کے خط کی باتیں

دُہرا کر لکھا کہ:

''اسد اور شیر، اور بت اور خدا، اور جفا اور وفا، یہ میری طرزِ گفتار نہیں ہے''۔[۱۸]

تغیرِ ذوق

اگر چہ معنویت پسندی کے بے جا توغل نے میرزا صاحب کو عرصے تک بیدلؔ، اسیرؔ اور شوکتؔ بخاری کے دام میں پھنسائے رکھا، مگر آخر کار بے مزہ معنی آفرینی سے خود بھی بچنے لگے۔ اور شاگردوں کو بھی ہدایت کی کہ نزاکتِ تخیل کو قیدِ لطف سے آزاد نہ ہونے دیا جائے۔ جنون بریلوی کے ایک مطلعے کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن وکاہ برآوردن، یعنی لطف زیادہ نہیں''۔[۱۹]

میرزا صاحب کی شاعری کا یہ طلسماتی رنگ اُڑا، تو اُن میں لطفِ زبان سے حظ اندوز ہونے کی صلاحیت بھی ترقی پکڑ گئی، اور اُن کے قلم سے معنی آفرینی کی تعریف و تحسین کے ساتھ ساتھ سلاستِ الفاظ، ندرتِ اسلوبِ ادا، اور دل نشینیِ بیان وغیرہ کی داد بھی نکلنے لگی۔ چناں چہ ایک قصیدے کی تعریف میں فرماتے ہیں:

''ہزار آفریں! کیا اچھا قصیدہ ہے۔ واہ، واہ، چشمِ بد دور! تسلسلِ معنی، سلاستِ الفاظ''۔[۲۰]

مہرؔ کے قصیدے کے متعلق زیادہ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

''زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشیں''۔[۲۱]

شفقؔ کی ایک فارسی غزل کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''کیا پاکیزہ زبان ہے، اور کیا طرزِ بیان!''۔[۲۲]

بیخبرؔ کی ایک نئی زمین کی فارسی غزل پڑھ کر لکھا ہے:

''کیا کہنا ہے! 'ابداع' اس کو کہتے ہیں۔ 'جدتِ طرز' اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بر روے کار لائے ہو''۔[۲۳]

مہرؔ کی غزل کے ایک شعر کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتنا خوب ہے، اور اُردو کا کیا اچھا اسلوب ہے!''۔[۲۴]

نوابِ باندہ کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''زہے لطفِ طبع، وحدتِ ذہن، وسلاستِ فکر، وحسنِ بیاں'' [۲۵]

نساخ کے دیوان پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں دروغ گو نہیں۔ خوشامد میری خو نہیں۔ دیوانِ فیض عنوان اسم با مسمّٰی ہے۔ 'دفترِ بے مثال' اس کا نام بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی بلند، مضامین عمدہ، بندش دل پسند'' [۲۶]

مہر کی مثنوی کے متعلق فرماتے ہیں:

''مثنوی پہنچی۔ جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں۔ کیا خوب بول چال ہے! انداز اچھا، بیان اچھا، روزمرہ صاف'' [۲۷]

رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے ایک شعر کے متعلق لکھتے ہیں:

''رجب علی بیگ سرور نے جو 'فسانۂ عجائب' لکھا ہے، آغازِ داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزا دیتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے، اور 'یاد رکھنا' فسانے کے ساتھ کتنا مناسب'' [۲۸]

میزانِ شعر

مذکورۂ بالا تفصیل کے پیشِ نظر میرزا صاحب نے ایک 'میزان' مقرر کی ہے، اور اُس میں چند اچھے شعروں کو تول کر دکھا دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس رقعے میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب اُن صاحبوں کے کلام کو، یعنی ہندیوں کے اشعار کو، قتیلؔ اور واقفؔ سے بیدلؔ اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔ میزان یہ ہے:

رودکیؔ و فردوسیؔ سے لے کر خاقانیؔ و سنائیؔ و انوریؔ وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔

پھر حضرتِ سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدیؔ و جامیؔ و ہلالیؔ یہ اشخاص متعدد نہیں۔

فغانیؔ ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانیِ بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوریؔ و نظیریؔ و عرفیؔ و نوعیؔ نے۔ سبحان اللہ! قالبِ سخن میں جان پڑ گئی۔

اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربا دیا۔ صائبؔ و کلیمؔ و سلیمؔ و قدسیؔ و حکیم شفائیؔ اس زمرے میں ہیں۔

رودکیؔ و اسدیؔ و فردوسیؔ، یہ شیوہ سعدیؔ کے وقت میں ترک ہوا۔ اور سعدیؔ کی طرز نے بسبب سہلِ ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانیؔ کا انداز پھیلا اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہونے لگے۔

تو اب طرزیں تین ٹھہریں:

(۱) خاقانیؔ، اُس کے اقران، (۲) ظہوریؔ، اُس کے امثال، (۳) صائبؔ، اُس کے نظائر۔

خالصاً للہ! ممتازؔ و اخترؔ وغیرہم کا کلام، ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ بس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے! خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے، مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکّہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد! انصاف، انصاف!

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ولے با بادۂ بعضے حریفاں
خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم
ورائے شاعری، 'چیزے دیگر' ہست

وہ ''چیزِ دگر'' جسے میں پارسیوں کے آئی ہے۔ ہاں، اُردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے:

میر تقی میر علیہ الرحمہ:

بدنام ہو گے، جانے بھی دو امتحان کو رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو؟

سودا:

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار خواہاں نہیں، لیکن، کوئی واں جنسِ گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی، کیوں کر مانوں ہے تو ناداں، مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو، گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیر ونشتر ہیں۔ مگر مجھے اُن کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا"۔

خلاصۂ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ میرزا صاحب کے نزدیک اچھے شعروں میں، لفظاً، سلاست و متانتِ الفاظ، پاکیزگی و صفائیِ روزمرہ، ندرت و دل پسندیِ بندش اور حسنِ بیان؛ اور معناً، بلندیِ خیال، نزاکتِ معنی، عمدگیِ مضمون، اور سلاست و تازگیِ فکر ہونا چاہیے۔ اسی کا نام شیوا بیانی ہے، اور یہی خوبیاں کلام کو "سہلِ ممتنع" بناتی ہیں۔ ایک خط میں فرماتے ہیں:

"خودستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا، تو فقیر کی نظم و نثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے گا"۔[۲۹]

انتخاب پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑی حد تک انھیں صفاتِ لفظی و معنوی کو میرزا صاحب نے معیارِ انتخاب قرار دیا ہے۔ چناں چہ وہ تمام فارسی و اُردو اشعار، جن میں بے مزہ تخییل کارفرما تھی، یا بے لطف اور دور از کار تشبیہیں اور استعارے استعمال ہوئے تھے، یا غیر مانوس فارسی ترکیبیں جلوہ گر تھیں، انتخاب میں شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ اسی طرح وہ شعر بھی شاملِ انتخاب نہیں ہو سکے ہیں، جن میں اگرچہ کوئی عیب تو نہیں پایا جاتا، لیکن اُسی غزل کے دوسرے اشعار کے مقابلے میں اُن کا درجۂ حسن و خوبی پست تر ہے۔ صنفِ اوّل کی مثال میں دیوانِ قدیم کی متروکہ غزلوں کے علاوہ حسبِ ذیل اشعار بھی پیش کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ شمارِ سُبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

۲۔ نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

صنفِ دوم کی تمثیل میں یہ شعر کام آسکتے ہیں:

۱۔ سب کو مقبول ہے دعوے تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئنہ سیما نہ ہوا

۲- موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے

لیکن دیوانِ اُردو اور فارسی میں بہت سے ایسے شعر بھی نظر آتے ہیں، جو اپنی خوبیوں کے باعث ہر طرح مستحقِ انتخاب تھے، مثلاً:

۱- حالِ ما از غیر می پرسی و منت می بریم
آگہی، بارے، کہ آگہ نیستی از حالِ ما

۲- مرنج از ناروائے، بے نیازی عالمے دارد
حکایتہا بود از خویشتن من بیزباناں را

۳- خوشست افسانۂ دردِ جدائی مختصر، غالبؔ
بکثرمیتواں گفت، آنچہ دردل ماندہ است امشب

۴- رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود
لیک صنم بسجدہ در، ناصیہ مشترک نخواست

۵- گر منافق، وصل ناخوش؛ ور موافق، ہجر تلخ
دیدہ داغم کرد؛ روے دوستاں دیدن نداشت

۶- زیستم بے تو وزیں ننگ نہ کشتم خود را
جاں فدائے تو! میا، کز تو حیا می آید

۷- مقصودِ ما ز دیر و حرم، جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ، بداں آستاں رسد

۸- گفتم: "گرہ زکارِ دل و دیدہ باز کن"
از جبہہ ناکشودہ، بہ بندِ نقاب بُرد

۹- اگر بدل نخلد، ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد!
۱۰- حریفِ منتِ احباب نیستم، غالبؔ
خوشم، کہ کارِ من از سعی چارہ گر گزرد

۱۱- می بزہاد مکن عرض، کہ ایں جوہرِ ناب
پیشِ ایں قوم، بشورابۂ زمزم نرسد

۱۲- بیاورید، گر اینجا بود زباندانی
غریبِ شہر سخنہاے گفتنی دارد

۱۳- شوق گستاخ و تو سرمست، بدا رسوائی!
ہاں، ادائے کہ دل و دستِ من از کار برد

۱۴- رو، تن بہ بلا دہ، کہ دگر بیمِ بلا نیست
مرغِ قفسے کشمکشِ دام ندارد

۱۵- اگر نہ مایلِ بوسِ لبِ خودست، چرا
بلب، چو تشنہ، دمادم زباں بگرداند؟

۱۶- ذوقیست ہمدمے بہ فغاں، بگزرم ز رشک
خارِ رہت بپاے عزیزاں خلیدہ باد!

۱۷- سرمایۂ خرد بجنوں دہ، کہ ایں کریم
یک سود را ہزار زیاں میدہد عوض

۱۸- تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریشتر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

۱۹- بجنگ، باج ستانانِ شاخسارے را
تہی سبد، ز درِ گلستاں بگردانیم
۲۰- بہ صلح، بالفشانانِ صبح گاہی را
ز شاخسار، سوے آستاں بگردانیم

۲۱- واے دیوانگیِ شوق! کہ ہردم مجھکو
آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا

۲۲- بجلی اک کوندگئی آنکھوں کے آگے، تو کیا؟
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

۲۳- گو میں رہا رہینِ ستمہاے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

۲۴- غمِ ہستی کا، اسدؔ، کس سے ہو، جز مرگ، علاج؟
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

۲۵- تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

۲۶- جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر، نہیں

۲۷- کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"!

۲۸- جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی، گویا رگِ جاں ہو گئیں

۲۹- ہاں، وہ نہیں خدا پرست؛ جاؤ، وہ بے وفا سہی
جس کو ہوں دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

۳۰- قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو
۳۱- یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

۳۲- کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟"
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں، کیوں ہو؟"

۳۳- رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو
۳۴- بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو
۳۵- پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیمار دار

اور اگر مرجایئے، تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۳۶- مرے دل میں ہے، غالبؔ، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جب اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی!

۳۷- بس، ہجومِ نا اُمیدی، خاک میں مل جائے گی
وہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

۳۸- ہر بلہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی

۳۹- جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

۴۰- عشق پر زور نہیں؛ ہے یہ وہ آتش، غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

۴۱- جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

۴۲- زباں پہ، بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ان جیسے شعروں کو نظر انداز کر دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میرزا صاحب نے یہ انتخاب چند روز کے اندر مرتب کیا تھا۔ عجلت میں یوں بھی ذہن کی تمام قوتیں کامل اشتراک و ہم آہنگی سے کام نہیں کر سکیں۔ میرزا صاحب کے یہاں اس پر مستزاد یہ تھا کہ آئے دن کی بیماریوں سے اُن کے قوای ظاہر و باطن بے حد کمزور و ناتواں ہو گئے تھے۔ تنگ دستی اور پریشان روزگاری نے طرح طرح کی دماغی الجھنوں میں الگ گرفتار کر دیا تھا۔ اب اُنھیں شعر و سخن کی جگہ کافور و کفن

کی پڑی رہتی تھی، اور صرف موت کی آس پر جی رہے تھے۔ ان حالات میں مستبعد نہیں کہ اچھے بُرے میں فرق وتمیز کرتے وقت اُن سے اچھے شعر نظر انداز ہو گئے ہوں، اور دو چار معمولی اشعار کو کسی وقتی جذبے کے ماتحت چُن لیا ہو۔

بہر حال، یہ انتخاب بے حد قابلِ قدر، اور غالبؔ سے متعلق ادب میں ایسا نایاب اضافہ ہے، جس کی قدر و قیمت میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔

خدا کرے، بندگانِ ہمایونِ اعلاحضرت، دام اقبالہم وملکم کی بارگاہ میں اس کو شرفِ قبول عطا ہو۔ آمین!

احقر

امتیاز علی عرشی

یہ کتاب عبدالصمد شرف الدین نے شرف الدین والاد کے مطبعۂ قیمہ، واقع نمبر ۲۹ شارع محمد علی، بمبئی نمبر ۳، میں طبع کی؛ اور کتاب خانۂ ریاست رامپور، یو. پی سے شائع ہوئی۔

حواشی:

۱ کتابِ مذکور: ۱۸۶، طبع دہلی، ۱۸۴۷ء۔
۲ یادگارِ غالب: ۱۹۸، مطبع نامی، کانپور، ۱۸۹۷ء۔
۳ عود: ۱۵۹۔
۴ کلیاتِ فارسی: ۵۵۴، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۶۳ء۔
۵ دیوانِ ریختہ: ۳، مطبع مفید خلائق، آگرہ، ۱۸۶۳ء۔
۶ مولانا حسرت موہانی نے شرح دیوانِ غالب کے آخر میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ ان کے پاس محفوظ ہے، عرشی کے زبانی استفسار پر مولانا نے فرمایا کہ یہ اصل کتاب کا صرف ایک حصہ ہے۔
۷ مکاتیبِ غالب: ۹۷، ح: ۱۔

۸۔ ایضاً: ۸۰ و ۸۱۔

۹۔ میرزا صاحب کی یہ تصحیحات ص ۳، ۱۲، ۱۷، ۱۹، ۲۲، ۲۶، ۲۸، ۴۳، ۶۱، ۶۴، ۶۸، ۶۹، ۷۴، ۸۳ پر پائی جاتی ہیں۔

۱۰۔ کلیاتِ نثر: ۳۹۶۔

۱۱۔ عود: ۱۸۔

۱۲۔ کلیاتِ نثر: ۲۴۲۔

۱۳۔ خطوط: ۱، ۸۴۔

۱۴۔ کلیاتِ نظم، دیباچہ: ۱۱۔

۱۵۔ کلیاتِ نثر: ۲۱۷۔

۱۶۔ خطوط: ۱، ۸۴۔

۱۷۔ اُردو: ۳۷۔

۱۸۔ اُردو: ۲۱۲: عود: ۱۲۶۔

۱۹۔ خطوط: ۱، ۱۲۵۔

۲۰۔ ایضاً: ۱، ۹۷۔

۲۱۔ اُردو: ۲۶۵۔

۲۲۔ ایضاً: ۳۱۳، عود: ۵۴۔

۲۳۔ اُردو: ۲۷۹، عود: ۲۷۵۔

۲۴۔ اُردو: ۲۶۸، عود: ۱۱۱۔

۲۵۔ کلیاتِ نثر: ۲۳۲۔

۲۶۔ اُردو: ۲۰۴، عود: ۱۲۵۔

۲۷۔ اُردو: ۲۵۰، عود: ۱۱۷۔

۲۸۔ اُردو: ۱۰۵۔

۲۹۔ اُردو: ۱۴۹، ۱۵۰، عود: ۴۵، ۴۶۔ شفق کو اختصاراً صرف دو روشیں بتائی ہیں: متقدمین یعنی امیر خسرو اور سعدی اور جامی کی روش، اور متاخرین، یعنی صائب و کلیم و قدسی کا انداز۔ ملاحظہ ہو اُردو: ۳۱۵۔ عود: ۵۱۔

۳۰۔ عود: ۱۴۰۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

انتخابِ غالب

فارسی

چند رنگیں نکتۂ دلکش؛ تکلّف برطرف!

دیدہ ام دیوانِ غالب: انتخابے بیش نیست!!

بسم اللہ الرّحمٰن الرِّحیم

غزلیات

﴿ الف ﴾

اے بخلا و ملا خوے تو ہنگامہ زا!!
با ہمہ در گفتگو، بے ہمہ با ''ماجرا''
شاہدِ حسنِ ترا، در روشِ دلبری
طرّۂ پُرخم صفات، موے میاں ''ماسوا''
خلد بہ غالبؔ سپار؛ زانکہ بدان روضہ در
نیک بود عندلیب خاصہ نوآئیں نوا

—(۲)—

خوے شرمِ گنہ، در پیشگاہِ رحمتِ عامت
سہیل و زہرہ افشاندز سیمار روسیاہاں را
بدلہا ریختی یکسر شکستن ہم ز یزداں داں
کہ لختے برخمِ زلف و کلہ زدکجکلاہاں را

—(۳)—

خاموشیِ ما گشت بدآموز بتاں را
زیں پیش، وگرنہ، اثرے بود فغاں را
موئے کہ بروں نامدہ باشد، چہ نماید؟
بیہودہ، در اندامِ تو جُستیم میاں را
بر طاعتیان فرّخ و بر عشرتیاں سہل!
نازم شبِ آدینۂ ماہِ رمضاں را!
اے خاکِ درت قبلۂ جان و دلِ غالب!
کز فیضِ تو، پیرایۂ ہستیست جہاں را
تا نامِ تو، شیرینیِ جاں دادہ بگفتن
در خویش فرو بردہ دل، از مہر، زباں را
بر امّتِ تو، دوزخِ جاوید حرامست
حاشا کہ شفاعت نکنی سوختگاں را!

—(۴)—

ما ہمائے گرم پروازیم، فیض از ما مجوی
سایہ، ہمچوں دود، بالا میرود از بالِ ما
جانِ غالبؔ! تابِ گفتارے گماں داری ہنوز؟
سخت بیدردی کہ میپرسی ز ما احوالِ ما!

—(۵)—

گر بیائی مست ناگاہ، از درِ گلزارِ ما
گل، ز بالیدن، رسد تا گوشۂ دستارِ ما
چاکِ ''لا'' اندر گریبانِ جہات افگندہ ایم
بے جہت بیروں خرام، از پردۂ پندارِ ما
ذرّہ، جز در روزنِ دیوار، نکشو دست بار
جنسِ بیتابی بدزدی بردہ، از بازارِ ما

—(۶)—

من و ذوقِ تماشاے کسے، کز تابِ رخسارش
جگر بر تا بہ چسپد، آفتابِ عالم آرا را!
دلِ مایوس را، تسکیں بہ مردن میتواں دادن
چہ امیدست، آخر، خضر و ادریس و مسیحا را!

—(۷)—

بپالیش جاں فشاندن شرمسارم کرد، میدانم
کہ داند: ارزشی نبود متاعِ رایگانی را

—(۸)—

محو کن نقشِ دوئی از ورقِ سینۂ ما
اے نگاہت الفِ صیقلِ آئینۂ ما!!

عرصه بر الفتِ اغیار چه تنگ آمده است!
خوش فرو رفته بطبعِ تو، خوشا کینۂ ما!!

—(۹)—

سوزِ عشقِ تو، پس از مرگ، عیانست مرا
رشتۂ شمعِ مزار، از رگِ جانست مرا
دل خود از تست و ہم از ذوقِ خریداریِ تست
ایں ہمہ بحث کہ در سود و زیانست مرا
چوں پریزاد کہ در شیشہ فرود آرند
روے خوبت، بدل از دیدہ نہانست مرا

—(۱۰)—

بےتو، چوں بادہ کہ در شیشہ ہم از شیشہ جداست
نَبوَد آمیزشِ جاں، در تنِ ما، با تنِ ما
تا رَوَد شکوۂ تیغِ ستم آسان از دل
بخیہ، بر زخم پریشیاں فتد، از سوزنِ ما
می پرد مور؛ مگر جاں بسلامت بَبَرد
تا چہ برقست کہ شد نامزدِ خرمنِ ما!
ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی، غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما!

—(۱۱)—

با بندهٔ خود، ایں ہمہ سختی نمی کنند
خود را، بزرو بر تو، مگر، بستہ ایم ما؟
سوزِ ترا، رواں ہمہ در خویشتن گرفت
از داغ، تہمتی بہ جگر بستہ ایم ما
گوئی: ''وفا ندارد اثر''، ہم بما گراے
زیں سادگی، کہ دل بہ اثر بستہ ایم ما

—(۱۲)—

در گردِ غربت، آئینہ دارِ خودیم ما
یعنی ز بیکسانِ دیارِ خودیم ما
با چوں توئے معاملہ، بر خویش منّت ست
از شکوۂ تو، شکر گزارِ خودیم ما
غالبؔ، چو شخص و عکس، در آئینۂ خیال
با خویشتن یکے و دوچارِ خودیم ما

—(۱۳)—

بروے برگِ گل، تا قطرۂ شبنم نہ پنداری
بہار، از حسرتِ فرصت، بدندانِ میگزد لبہا
کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیہاے ما، گردوں
نیاید خشت، مثلِ استخوان، بیروں ز قالبہا

—(۱۴)—

پس از عمرے کہ فرسودم بمشقِ پارسایہا
گدا گفت و بمن تن درنداد، از خود نمایہا
نیرزم التفاتِ دزد و رہزن؛ بی نیازی بیں:
متاعم را بغارت دادہ اند، از ناروایہا

—(۱۵)—

جاں بر نتابد، اے دل! ہنگامۂ ستم را
از سینہ ریز بیروں، مانندِ تیغ، دام را
بیوجہ در رہت نیست، از پا فتادنِ من
بر دیدہ می نشانم، در ہر قدم، قدم را
مانندِ خارزارے کاتش زنند در وے
سوزد، ز بیمِ خویت، اجزاے نالہ ہم را

—(۱۶)—

من آن نیَم کہ دگر میتواں فریفت مرا
فریبمش کہ مگر میتواں فریفت مرا
بحرفِ ذوقِ نگہ، میتواں ربود مرا
بوہمِ تابِ کمر، میتواں فریفت مرا
من و فریفتگی، ہرگز آں محال اندیش
چرا فریفت، اگر میتواں فریفت مرا؟

ز بازِ نامدنِ نامہ بر خوشم کہ ہنوز
بہ آرزوے خبر، میتواں فریفت مرا
شبِ فراق ندارد سحر؛ ولے یک چند
بگفتگوے سحر، میتواں فریفت مرا

—(۱۷)—

ز من گرت نبوَد باور انتظار، بیا
بہانہ جوے مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم، دل نمی شود خرسند
بمرگِ من! کہ بسامانِ روزگار بیا
بہانہ جوست در الزامِ مدعی، شوقت
یکے، برغمِ دلِ ناامیدوار، بیا!
ہلاکِ شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را
عناں گسستہ تر از بادِ نوبہار، بیا!
وَداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا!

—(۱۸)—

چوں بقاصد بسپرم پیغام را
رشک نگزارد کہ گویم نام را
گشتہ در تاریکیِ روزم نہاں
کو چراغے، تا بجویم شام را؟

آں مَیَم باید کہ چوں ریزم بجام
زورِ مے در گردش آرد جام را
تا نیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود، گر دانہ نبود دام را!
زحمتے عامست دایم خاص را
عشرتے خاصست ہردم عام را

—(۱۹)—

در ہجر، طرب بیش کند تاب و تبم را
مہتاب، کفِ مارِ سیاہست، شبم را
ترسم کہ دہد نالہ جگر را بدریدن
قطعِ نظر از جیب، بدوزید لبم را

—(۲۰)—

بر نمی آید ز چشم، از جوشِ حیرانی مرا
شد نگہ زنّارِ تسبیحِ سلیمانی مرا
وہ! کہ پیش از من بپابوسِ کسے خواہد رسید
سجدۂ شوقے، کہ می بالد بہ پیشانی مرا
ہمچنیں بیگانہ زی با من، دل و جانِ کسے!
بدگماں گردم، اگر دانم کہ میدانی مرا!

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی، مرا

—(۲۱)—

از وہمِ قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو وا رسیم، ہماں قلزمیم ما
مُردم، بکینہ، تشنۂ خونِ ہمند و بس
خوں می خوریم، چوں ہم ازیں مردمیم ما

—(۲۲)—

بہ بیم افگندہ مے را، چارۂ رنجِ خمارِ ما
قدح بر خویش می لرزد، ز دستِ رعشہ دارِ ما
فروزد ہر قدر رنگِ گل، افزاید تب و تابش
کبابِ آتشِ خویشست، پنداری، بہارِ ما

—(۲۳)—

بپایانِ محبت، یاد می آرم زمانے را
کہ دل، عہدِ وفا نابستہ، دادم دلستانے را

ندارم تابِ ضبطِ راز و میترسم ز رسوائی
مگر جویم، ز بہرِ ہمزبانی، بیزبانے را
بشہر از دوست، بعد از روزگارے، یافتم غالبؔ
ز عنوانِ خطے، کز راہِ دور آمد، نشانے را

—(۲۴)—

از تست اگر ساختۂ، پرداختۂ ما
کفرے نبود مطلبِ بیساختۂ ما
وقتست کہ چوں گرد، ز تحریکِ نسیمے
ریزد پَرَ و بال از قفسِ فاختۂ ما

—(۲۵)—

خوش وقتِ اسیری! کہ برآمد ہوسِ ما
شد، روزِ نخستیں، سبدِ گل قفسِ ما
آوازۂ شرع از سرِ منصور بلندست
از شبروِیِ ماست، شکوۂ عسسِ ما
در دہر، فرو رفتۂ لذت نتواں بود
بر قند، نہ بر شہد، نشیند مگسِ ما

—(۲۶)—

ز پیکانہاے ناوک، در دلِ گرمم نشاں نبود
بریگستاں چہ جوئی، قطرہ ہاے آبِ باراں را؟
کفِ خاکیم؛ از ما برنخیزد جز غبار آنجا
فزوں از صرصری نبود قیامت، خاکساراں را
درآ بیخود ببازی گاہِ اہلِ حسن؛ تا بینی،
بروے شعلہ، گرمِ مشقِ جولاں، نے سوراں را

—(۲۷)—

ز پیدائی، حجابِ جلوہ ساماں کردنش نازم!
کفِ صہباست، گوئی، پنبہ میناے شرابش را
دمِ صبحِ بہار، ایں مایہ مدہوشی نمی ارزد
صبا بر مغزِ دہر افشاندہ، گوئی، رختِ خوابش را
ز خواباں جلوہ، و زما بیخوداں جاں، رونما خواہد
خریدارست، ز انجم تا بہ شبنم، آفتابش را

—(۲۸)—

مدام محرمِ صہبا بود، پیالۂ ما
بگردِ مہر، تنیدست خطّ ہالۂ ما

چمن طرازِ جنونیم و دشت و کوه از ماست
به مُہرِ داغِ شقایق بود قبالۂ ما
درازیِ شبِ ہجراں ز حد گزشت، بیا
فدائے روے تو عمرِ ہزار سالۂ ما!
ز سعیِ ہرزہ، بہ بے حاصلی علم گشتیم
چو باد، بید پدید آمد، از امالۂ ما
بدل، ز جورِ تو، دنداں فشردہ ایم و خوشیم
ز استخواں اثرے نیست در نوالۂ ما

—(۲۹)—

کدام آئینہ با روے او مقابل شد
کہ بیقراریِ جوہر نبرد زنگش را؟
چو غنچہ، جوشِ صفاے تنش، ز بالیدن
درید بر تنِ نازک قباے تنگش را
جگر نشانہ نہم، بر خود اعتمادم نیست
مباد! دل، بہ تپش، رد کند خدنگش را

—(۳۰)—

زیں بہار آئیں نگاہاں، بُو کہ پذیرد یکے
عمرہا شد، رخ بخونِ دیدہ میشوئیم ما!
آفتابِ عالمِ سرگشتگیہاے خودیم
تا بزانو سودہ پاے ما و میپوئیم ما

—(۳۱)—

داغم کہ در ہواے سرِ دامنِ کسیست!
در خونِ من، ز ناز، فرو بردہ چنگ را
در بزم، مَے بجامِ زمرد نخوردۂ:
سنجد بدشت جلوۂ داغِ پلنگ را
در گوشۂ خزیدہ، ز اندوہِ بیکسی
آں برشکستہ خلوتِ دلہای تنگ را
غالبؔ، ز عاشقی بہ ندیمی رسیدہ ام
نازم شگرفکاریِ بختِ دو رنگ را!

—(۳۲)—

سوزد، ز بسکہ، تابِ جمالش نقاب را
دانم کہ درمیاں نہ پسندد حجاب را
پیراہن از کتاں و دمادم، ز سادگی
نفریں کند، بہ پردہ دری، ماہتاب را
نازم فروغِ بادہ زعکسِ جمالِ دوست!
گوئی، فشردہ اند بجام آفتاب را
آبش دہم بہ بادہ و او ہردم، از تمیز
نوشد مے و ز جام فرو ریزد آب را
تا خود شبے بہ ہمدمیِ ما بسر برد
در چشمِ بختِ غیر، رہا کرد خواب را

—(۳۳)—

چناں گرمست بزم از جلوۂ ساقی، کہ پنداری،
گدازِ جوہرِ نظارہ در جامست، مستاں را
تکلّف برطرف، لب تشنۂ بوس و کنارستم
ز راہم باز چیں، دامِ نوازشہای پنہاں را
باندازِ صبوحی، چوں بگلشن ترکتاز آری،
پریدنہاے رنگِ گل شفق گردد گلستاں را

رسیدنہاے منقارِ ہما بر استخواں، غالب
پس از عمرے، بیادم داد رسم و راہِ پیکاں را

—(۳۴)—

بخلوت، مژدهٔ نزدیکیِ یارست پہلو را
فریبِ امتحانِ پاکبازی دادہ ام او را
جہاں، از بادہ و شاہد، بداں ماند کہ، پنداری
بدنیا از پسِ آدم فرستادند، مینو را
نباشد دیدہ تا حق بیں، مدہ دستوریِ اشکش
چو گوہر سنج، کو پیش از گہر سنجد ترازو را

—(۳۵)—

بسکہ غمِ تو بودہ است تعبیہ در سرشتِ ما
نسخهٔ فتنہ می برد، چرخ ز سرنوشتِ ما
بردہ صد اربعین بسر، بر سرِ صد ہزار خُم
گر بنہی در آفتاب، بادہ چکد ز خشتِ ما
بادہ اگر بود حرام، بذلہ خلافِ شرع نیست
دل تہی بخوبِ ما، طعنہ مزن بزشتِ ما

—(۳۶)—

دل تابِ ضبطِ نالہ ندارد؛ خدائے را!
از ما مجوی گریۂ بے ہائے ہائے را
سر منزلِ رسائیِ اندیشۂ خودیم
در ما گمست جلوہ پئے رہنمائے را
حسنِ بتاں، ز جلوۂ نازِ تو، رنگ داشت
بیخود، بہ بوئے بادہ، کشیدیم لائے را
یارب! ببالِ تیغ کہ پرواز می کند؟
ننگست دوش، فرقِ بلندی گرائے را
مُردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی شوم
یارب! کجا برم لبِ خنجر ستائے را؟

—(۳۷)—

تا دوخت چارہ گر جگرِ چار پارہ را
از بخیہ، خندہ بر دمِ تیغست چارہ را
سرگرمِ مہر شد دلِ چرخِ ستیزہ خو
چنداں کہ داغ کرد جبینِ ستارہ را
اے لذتِ جفائے تو، در خاک بعدِ مرگ
با جاں سرشتہ، حسرتِ عمرِ دوبارہ را

—(۳۸)—

طبیعی نیست ہر جا اختلاط، از وے حذر خوشتر
کم از سوزندہ آتش نیست، آبِ گرم ماہی را

دلا! گر داوری داری بچشمِ سرمہ آلودش
نخستم بی زباں کن، تا بکار آیم گواہی را

مرو در خشم، گر دستی بدامانِ تو زد غالبؔ
وکیلش من، نمی داند طریقِ داد خواہی را

—(۳۹)—

لرزہ دارد خطر، از ہیبتِ ویرانۂ ما
سیل را، پاے بسنگ آمدہ، در خانۂ ما

نفی از برقِ بلا تعبیہ دارد در خویش
دہنِ خاک کند آبلہ، از دانۂ ما

بچراغے نرسیدیم، دریں تیرہ سرا
شمعِ خاموش بود، طالعِ پروانۂ ما

مو برآید زکفِ دست، اگر، دہقاں را
نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانۂ ما

دادہ بر تشنگیِ خویش گواہی، غالبؔ
دہنِ ما، بزبانِ خطِ پیمانۂ ما

—(۴۰)—

اے گل از نقشِ کفِ پاے تو دامانِ ترا !
گلفشاں کرد، قبا، سروِ خرامانِ ترا
تا ز خونِ کہ ازیں پردہ شفق باز دمد؟
رونقِ صبح بہارست گریبانِ ترا
ہر قدر شکوہ، کہ در حوصلہ گرد آمدہ بود
گوے گردید، بہ مستی، خمِ چوگانِ ترا
چشم آغشتہ بخوں بین و ز خلوت بدر آی
اینگ! ابرِ شفق آلودہ گلستانِ ترا
چہ غم، ار سیلیِ سنگِ ستمش کرد کبود
سبزہ زاریست تنم طرفِ خیابانِ ترا

—(۴۱)—

غمت در بوتۂ دانش گدازد مغزِ خاماں را
لبت تنگِ شکر سازد دہانِ تلخ کاماں را
ز ہستی پاک شو، گر مردِ راہی؛ کاندریں وادی
گرانیہا ست، رختِ رہروِ آلودہ داماں را
بسا افتادہ سرمست و بسا خم گشتہ در طاعت
تو دانی، تا بہ لطف از خاک برداری کداماں را

جہاں را خاصی و عامیست: آں مغرور و ایں عاجز
بیا، غالبؔ، ز خاصاں بگزر و بگزار عاماں را

—(۴۲)—

نگویم، تازہ دارم شیوۂ جادو بیاناں را
ولے در خویش بینم کارگر، جادوے آناں را
ندارد حاجتِ لعل و گہر، حسنِ خدادادت
عبث در آب و آتش راندۂ بازارگاناں را
بہ لفظِ عشق، صد رہ کوہ و دریا درمیاں گفتن
بیاموزید، تا پیشش برید افسانہ خواناں را
نگیرد دیگراں را حق، بجرمے کز یکے بخشد
سرت گردم! شفیعے روزِ محشر دلستاناں را
نداند قدرِ غم، تا در نماند کس بداں، غالبؔ
مسرّت خیزد، از تقلیدِ پیراں، نوجواناں را

﴿ ب ﴾

عالم آئینۂ رازست، چہ پیدا، چہ نہاں
تابِ اندیشہ نداری، بہ نگاہے دریاب
گر بامعنی نرسی، جلوۂ صورت چہ کمست؟
خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہے دریاب

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شده
تشنہ، بے دلو و رسن، برسرِ چاہے دریاب
غالبؔ و کشمکشِ بیم و امیدش، ہیہات!
یا بہ تیغے بکُش و یا بہ نگاہے دریاب

—(۴۴)—

گر، پس از جور، بانصاف گراید، چہ عجب؟
از حیا روے بما گر نہ نماید، چہ عجب؟
بودش از شکوہ خطر؛ ورنہ سرے داشت بمن
بمزارم، اگر، از مہر بیاید، چہ عجب؟
رسمِ پیماں بمیاں آمدہ؛ خود را نازم!
گفتہ باشد کہ ''زبستن چہ کشاید''، چہ عجب؟
کار با مطربۂ زہرہ نہادے دارم
گر لبم نالہ بہنجار سراید، چہ عجب؟
آں کہ چوں برق بیک جاے نگیرد آرام
گلہ اش در دل اگر دیر نپاید، چہ عجب؟
با چنیں شرم کہ از ہستیِ خویشش باشد
غالبؔ ار رخ برہِ دوست نساید، چہ عجب؟

—(۴۵)—

جنوں محمل بصحرائے تحیّر رانده است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر وا مانده است امشب
زہے آسایشِ جاوید! ہچوں صورتِ دیبا
نمِ زخم تن و بستر بہم چسپانده است امشب
بقدرِ شامِ ہجرانش، درازی باد عمرش را!
فلک نیز از کواکب سُبحہ ہا گردانده است امشب

—(۴۶)—

ہاں! آئنہ بگوار کہ عکسم نفریبد
نظارهٔ یکتائیِ حق میکنم امشب
آتش بنہادم شده آب، از تفِ مغزم
از تب نبود، ایں کہ عرق میکنم امشب
نازم سخنش را و نیابم دہنش را
خوش تفرقہ در باطل و حق میکنم امشب



تو محوِ خواب، و سحر در تاسف، از انجم
بہ پشتِ دست بدنداں گزیدنست، مخسپ

نفس، ز نالہ، بہ سنبل درودنست، بخیز
ز خونِ دل، مژہ در لالہ چیدنست، مخسپ
نشاطِ گوش بر آوازِ قلقل است، بیا
پیالہ چشم براہِ کشیدنست، مخسپ
نشانِ زندگیِ دل دویدنست، مَایست
جلاے آئنۂ چشم دیدنست، مخسپ
ز دیدہ، سودِ حریفاں کشودنست، مبند
ز دل، مرادِ عزیزاں تپیدنست، مخسپ
بذکرِ مرگ شبے زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالبؔ شنیدنست، مخسپ

﴿ ت ﴾

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدست
آرے، کلامِ حق بزبانِ محمدست
آئینہ دارِ پرتوِ مہرست، ماہتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدست
تیرِ قضا، ہر آئنہ، در ترکشِ حقست
اما گشادِ آں ز کمانِ محمدست

دانی، اگر بمعنی "لولاک" وا رسی:
خود ہرچہ از حق است، ازانِ محمدست

ہر کس قسم، بدانچہ عزیزست، میخورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدست

واعظ، حدیثِ سایۂ طوبیٰ فروگزار؛
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدست

بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را
کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدست

ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمدست

غالبؔ، ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم؛
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدست

—(۴۹)—

عمریست کہ می میرم و مردن نتوانم
در کشورِ بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست

جنت نکند چارهٔ افسردگیِ دل:
تعمیر باندازهٔ ویرانیِ ما نیست
فریاد، ز زخمے کہ نمک سود نباشد!
ہنگامہ بیفزاے؛ کہ پرسش بسزا نیست
برگشتنِ مژگانِ تو از روے عتابست
کاندر دلم، از تنگیِ جا، یک مژہ جا نیست

—(۵۰)—

رشکِ دہانت گزاشت، غنچہٕ گل چوں شگفت
دید کہ از روے کار پردہ بر افتادہ است
آں ہمہ آزادگی، و ایں ہمہ دلدادگی!
حیف کہ غالبؔ ز خویش بیخبر افتادہ است!

—(۵۱)—

در گردِ نالہ، وادیِ دل رزمگاہِ کیست؟
خونے کہ میدود بشرائیں، سپاہِ کیست؟
رشک آیدم بروشنیِ دیدہ ہاے خلق
دانستہ ام کہ از اثرِ گردِ راہِ کیست
با من بخوابِ ناز و من از رشک بدگماں:
تا عرصہٕ خیالِ عدو جلوہ گاہِ کیست؟

بیخود، بوقتِ ذبح، تپیدن گناهِ من!
دانسته، دشنه تیز نکردن گناهِ کیست؟

—(۵۲)—

یاد از عدو نیارم و ایں ہم ز دور بینی است
کاندر دلم گزشتن، با دوست ہمنشینی است
در عالمِ خرابی، از خیلِ منعمانم
سیلم برخت شوئی، برقم بخوشه چینی است
نازم بزود یابی؛ نازد بگوش و گردن
چنداں که ابرِ نیساں در گوہر آفرینی است

—(۵۳)—

فریبِ آشتیِ ده، ظفر مبارک باد!
دلِ ستم زده در بندِ امتحانِ تو نیست
گمانِ زیست بود بر مَنَت ز بیدردی
بداست مرگ؛ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

—(۵۴)—

ایکه گفتی: ''غم درونِ سینه جاں فرساست'' ہست
خامشیم، اما اگر دانی که حق با ماست، ہست

این سخن حق بود و گاہے بر زبانِ ما نرفت
چوں تو خود گفتی کہ ''خوباں را دل از خار است،'' ہست
بارے از خود گو کہ چونی؛ ور ز من پرسی، مپرس
بختِ ناساز است؟ آرے؛ یارِ بے پرواست، ہست
خوے یارت را تو دانی؛ ورنہ از حسن و جمال
زلفِ عنبر بوست؟ دارد؛ عارضِ زیباست؟ ہست
صبر وانگاه از تو، پندرام، نہ حدِّ آدمیست
وانیکہ می گوئی: ''بظاہر گرمِ استغناست'' ہست

—(۵۵)—

سینہ بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتشست
بعد ازیں، گویند آتش را کہ ''گویا آتشست''
ہم بدیں نسبت ز شوخی در دلت جا کردہ ایم
فاش گوئیم: ''از تو سنگست، آنچہ از ما آتشست''
پاک خور امروز و زنہار از پےِ فردا منہ!
در شریعت، بادہ امروز آب و فردا آتشست

—(۵۶)—

بخود رسیدنش، از ناز، بسکہ دشوارست
چو ما، بدامِ تمنائے خود گرفتارست

تمامِ زحمتم؛ از هستیم چه می پُرسی!
ز جسمِ لاغرِ خویشم، به پیرہن خارست

بقامتِ من، از آوارگیست پیرہنے
کہ خارِ رہگزرش بود و جادہ اش تارست

غمم شنیدن و لختے بخود فرو رفتن
خوشا فریبِ ترحّم! چہ سادہ پُرکارست!

—(۵۷)—

سمومِ وادیِ امکاں، ز بس، جگر تابست
گدازِ زہرۂ خاکست، ہر کجا آبست

مرنج از شبِ تار و بیا بہ بزمِ نشاط
کہ پنبۂ سرِ مینائے بادہ مہتابست

ز وضعِ روزنِ دیوار، میتواں دانست
کہ چشمِ غم کدۂ ما براہِ سیلابست

قوی فتادہ چو نسبت، ادب مجو، غالبؔ
ندیدۂ کہ سوے قبلہ پشتِ محرابست

—(۵۸)—

نازم نگہِ شرم کہ دلہا ز میاں برد
زانساں کہ خود آں چشمِ فسوں ساز ندانست

یک چند بہم ساختہ، ناکام گزشتیم:
من عشوہ نہ پزرفتم و او ناز ندانست
گریم کہ برد موجۂ خوں خوابگہش را
در نالہ، مرا دوست ز آواز ندانست
مخمورِ مکافات بہ خلد و سفر آویخت!
مشتاقِ عطا شعلہ ز گل باز ندانست!

—(۵۹)—

ہر ذرّہ محوِ جلوۂ حسنِ یگانہ ایست
گوئی، طلسمِ شش جہت آئینہ خانہ ایست
حیرت بدہر، بے سر و پا، می برد مرا
چوں گوہر، از وجودِ خودم آب و دانہ ایست
ناچار، با تغافلِ صیاد ساختم
پنداشتم کہ حلقۂ دام آشیانہ ایست

—(۶۰)—

ہرچہ فلک نخواستست، ہیچ کس از فلک نخواست
ظرفِ فقیہ مے نجست، بادۂ ما گزک نخواست
غرقہ بموجہ تاب خورد، تشنہ ز دجلہ آب خورد
زحمتِ ہیچ یک نداد، راحتِ ہیچ یک نخواست

سہل شمرد و سرسری، تا تو ز عجز نشمری
غالبؔ اگر، بداوری، دادِ خود از فلک نخواست

—(۶۱)—

ما لاغریم، گر کمرِ یار نازکست
فرقیست درمیانہ کہ بسیار نازکست
دارم دلے، ز آبلہ نازک نہادتر
آہستہ پا نہم کہ سرِ خار نازکست
می رنجد، از تحمّلِ ما، بر جفاے خویش
ہاں شکوہٴ کہ خاطرِ دلدار نازکست!

—(۶۲)—

در کشاکشِ ضعفم، نگسلد رواں از تن:
اینکہ من نمی میرم، ہم ز ناتوانی ہاست
از خمیدنِ پشتم، روے بر قفا باشد
تا چہا، دریں پیری، حسرتِ جوانی ہاست!
کشتۂ دلِ خویشم، کز ستمگراں یکسر
دید دلفریبی ہا، گفت: ”مہربانی ہاست“
ایکہ اندریں وادی، مژدہ از ہما دادی!
بر سرم، ز آزادی، سایہ را گرانی ہاست

—(٦٣)—

داد از تظلّمے کہ بگوشت نمی رسد!
آه از توقعے کہ وجودش نمانده است!
غالبؔ زباں بریده و آگنده گوش نیست
اما دماغِ گفت و شنودش نمانده است

—(٦٤)—

از دوست، میلِ قرب بہ کشتن، غنیمتست
گر تیغ، ور کماں، بہ نشاطِ کمند نیست
آں لا بہ ہاے مہر فزا را محل نماند
برخوان خود ''اِنْ یَّکاد'' کہ مارا سپند نیست

—(٦٥)—

منعِ ما از باده، عرضِ احتسابے بیش نیست
محتسب، افشردۂ انگور آبے بیش نیست
رنج و راحت برطرف! شاہد پرستانیم ما
دوزخ، از سرگرمیِ نازش، عتابے بیش نیست
قطره و موج و کف و گرداب جیحونست و بس
ایں من و مائی کہ می بالد، حجابے بیش نیست

خویش را، صورت پرستاں ہرزہ رسوا کردہ اند!
جلوہ می نامند و در معنی نقابے بیش نیست
شوخیِ اندیشہٴ خویشست، سر تا پاے ما
تار و پودِ ہستیِ ما پیچ و تابے بیش نیست
نامہ بر، از پیشگاہِ ناز، مکتوبِ مرا
پاسخے آوردہ است؛ اما جوابے بیش نیست
چند رنگیں نکتہٴ دلکش، تکلف برطرف!
دیدہ ام دیوانِ غالب: انتخابے بیش نیست

—(٦٦)—

لذتِ عشقم، ز فیضِ بینوائی، حاصلست
آنچناں تنگست دستِ من کہ، پنداری، دلست
بسکہ ضبطِ مشقِ غم فرسود اعضاے مرا
رازِ دل از ہمنشینانم نہفتن مشکلست
عقل در اثباتِ وحدت خیرہ می گردد چرا؟
ہرچہ جز ہستیست ہیچ و ہرچہ جز حق باطلست
ما ہماں عینِ خودیم؛ اما خود از وہمِ دوئی
درمیانِ ما و غالبؔ، ما و غالب حائلست

—(٦٧)—

ہم وعدہ و ہم منع ز بخشش، چہ حسابست؟
جاں نیست؛ مکرر نتواں داد: شرابست
در مژدہ ز جوے عسل و کاخِ زمرد
چیزے کہ بہ دلبستگی ارزد، مےِ نابست
باایں ہمہ دشوار پسندی، چہ کند کس؟
تا پردہ برانداختہ، در بندِ حجابست

—(٦٨)—

ریگ در بادیۂ عشق روانست ہنوز
تا چہا پاے دریں راہ بفرسودن رفت!
باخت از بسکہ زلیخا، بہ تماشاے تو، رنگ؛
از حیا، بر درِ زنداں بگل اندودن رفت

—(٦٩)—

نظارہ عرضِ جمالتِ ز نوبہار گرفت
شکوۂ صاحبِ خرمن ز خوشہ چیں پیداست
رسید تیغِ تو ام بر سر و ز سینہ گزشت
زہے شگفتگیِ دل، کہ از جبیں پیداست!

بجرمِ دیدهٔ خونبار، کشتهٔ ما را
ترا ز دامن و ما را ز آستیں پیداست
زہے شکوهٔ تو! کاندر طرازِ صورتِ تو
ز خود برآمدنِ صورت آفریں پیداست

—(۷۰)—

گر بار نیست، سایہ خود از بید بوده است
بارے، بگو کہ ''از تو چہ امّید بوده است''
ظالم ہم، از نہادِ خود، آزار میکشد
بر فرقِ ارّه، ارّهٔ تشدید بوده است

—(۷۱)—

یار، در عہدِ شبابم، بکنار آمد و رفت
ہمچو عیدے کہ در ایامِ بہار آمد و رفت
برق، تمثالِ سراپائے تو میخواست کشید
طرزِ رفتار ترا آئنہ دار آمد و رفت
ہلہ! غافل، ز بہاراں چہ طمع داشتۂ؟
گیر، کامسال برنگینیِ یار آمد و رفت

—(۷۲)—

اخترے خوشتر ازینم بجہاں می بایست
خردِ پیرِ مرا بختِ جواں می بایست
بزمینے کہ بآہنگِ غزل بنشینم
خاک گلبوے و ہوا مشک فشاں می بایست
برنتابم بسبو بادہ ز دور آوردن؛
خانۂ من بسرِ کوے مغاں می بایست
ہرزہ، دل بر در و دیوار نہادن نتواں
سویم، از روزنہ، چشمے نگراں می بایست

—(۷۳)—

در دلش جوئی و در دیر و حرم نشناسی:
تا چہ روداد، کہ در زاویہ پنہاں شدہ است؟
گفتم: ''البتہ ز من شاد بمردن گردی''
گفت:''دشوار؛ کہ مردن بتو آساں شدہ است''
دُردِ روغن بچراغ، و کدرِ مے بایاغ
تا خود از شب چہ بجا ماندہ کہ مہماں شدہ است؟
شاہد و مے ز میاں رفتہ و شادم بسخن:
کشتہ ام بید دریں باغ کہ ویراں شدہ است؟

—(۷۴)—

فغاں! کہ برقِ عتابِ تو آں چنانم سوخت
کہ راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت
شنیدۂ کہ بآتش نہ سوخت ابراہیم
ببیں کہ شرر و شعلہ می توانم سوخت
مرا دمیدنِ گل در گماں فگند امروز
کہ باز بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت

—(۷۵)—

گفتم: ''بروزگار سخنور چو من بسیست''
گفتند: ''اندریں کہ تو گفتی سخن بسیست''
معنی غریبِ مدعی و خانہ زادِ ماست:
ہرجا عقیق نادر و اندر یمن بسیست
مشکیں غزالہ ہا، کہ نہ بینی بہیچ دشت
در مرغزارہاے ختا و ختن بسیست
در صفحہ نبودم ہمہٗ آنچہ در دلست:
در بزم کمترست گل و در چمن بسیست

—(۷۶)—

چو صبحِ من، ز سیاہی، بشام مانندست
چہ گوئیم کہ ''ز شب چند رفت یا چند ست''؟
بہ رنج، از پیِ راحت، نگاہداشتہ اند
ز حکمتست کہ پاے شکستہ در بندست
ز بیمِ آں کہ، مبادا، بمیرم از شادی
نگوید، ارچہ بمرگِ من آرزومندست
اگر نہ بہرِ من، از بہرِ خود عزیزم دار؛
کہ بندہ، خوبیِ او خوبیِ خداوندست
نہ آں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب
بدیں، کہ پرسد و گویند: ''ہست''، خرسندست

—(۷۷)—

تُرکِ مرا، ز گیر و دار، شُغل عرض بود، نہ سود
فربہ اگر نیافت صید، خُردہ بہ لاغری گرفت

—(۷۸)—

در ہر مژہ برہم زدن، ایں خلق جدیدست
نظارہ سگالد کہ ہمانست و ہماں نیست

در شاخ بود موجِ گل، از جوشِ بهاراں
چو بادہ بمینا کہ نہانست و نہاں نیست
پہلو بشگافید و بہ بیید دلم را
تاچند بگویم کہ چسانست و چساں نیست!

—(۷۹)—

دل بُرد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت
در رزمگہش، ناچخ و خنجر نتواں برد
در بزمگہش، بادہ و ساغر نتواں گفت
رخشندگی، ساعد و گردن نتواں جُست
زیبندگیِ یارہَ و پَرگر نتواں گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند
ہموارہ تراشد بت و آزر نتواں گفت
از حوصلہ یاری مطلب؛ صاعقہ تیزست
پروانہ شو، اینجا ز سمندر نتواں گفت
ہنگامہ سرآمد، چہ زنی دم ز تظلّم؟
گر خود ستمے رفت، بحشر نتواں گفت

در گرمِ روی، سایه و سرچشمه نجوئیم
با ما، سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

آں راز کہ در سینہ نہانست، نہ وعظست
بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہؔ ما را!
مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت

—(۸۰)—

اندودہ بداغے، دو سہ پرکالہ فرو ریخت
چوں برگِ شقائق، جگر، از نالہ، فرو ریخت

بر سادہ دلانت، بوفا جلوہ ہمی داد
بیدادِ تو آبِ رخِ دلاّلہ فرو ریخت

رشکِ خطِ روے تو گر افشرد بدیں رنگ
بینی کہ مہ از دائرۂ ہالہ فرو ریخت

—(۸۱)—

خواست کز ما رنجد وتقریبِ رنجیدن نداشت
جرمِ غیراز دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت

آمد و از تنگیِ جا جبهہ پُرچیں کرد و رفت
برخود، از ذوقِ قدومِ دوست، بالیدن نداشت

گل فراواں بود و مے پرزور، دوشم بر بساط
خود بخود پیمانہ می گردید و گردیدن نداشت

جوشِ حسرت بر سرِ خاکم، ز بس، جا تنگ کرد
ہمچو نبضِ مردہ، دودِ شمع جنبیدن نداشت

—(۸۲)—

ترا کہ موجۂ گل تا کمر بود، دریاب
کہ غرقِ خوں بدرِ بوستاں سرائے تو کیست؟

بلا، بہ صورتِ زلفِ تو، رو بما آورد
بہ بندِ خصمی، دہریم؛ مبتلائے تو کیست؟

فرشتہ! معنیِ ''مَـــنْ رَبُّکَ؟'' نمی فہم
بمن بگوی کہ ''غالب، بگو، خدائے تو کیست؟''

—(۸۳)—

بودائی کہ دراں خضر را عصا خفتست
بسینہ می سپرم رہ، اگرچہ پا خفتست

به صبحِ حشر، چنیں خستہ روسیہ خیزد
کہ در شکایتِ درد و غمِ دوا خفتست
ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست
غمت بشہر شبیخوں زناں، بہ بنگہِ خلق
عسس بخانہ و شہ در حرم سرا خفتست
درازیِ شب و بیداریِ من، ایں ہمہ نیست
ز بختِ من خبر آرید، تا کجا خفتست
دگر ز ایمنیِ راہ و قربِ کعبہ چہ حظ؟
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست
بخواب، چوں خودم آسودہ دل مداں، غالب
کہ خستہ غرقہ بخوں خُفتہ است، تا خفتست

—(۸۴)—

کشتہ را رشکِ کشتۂ دگر است
من و زخمے کہ بر دل از جگر است!
مستی اندازِ لغزشے دارد
حیفِ پائے کہ آفتش ز سر است!
شہ حریر و گدا پلاس بُرید
آنچہ من قطع کردہ ام، نظر است

—(۸۵)—

نامہ، از سوزِ درونم، بہ رقم سوختہ شد
قاصد ار دم زند از حوصلہ، پیغامے ہست
گہ رخ آرائی و گہ زلفِ سیہ تاب دہی
یاد ناری کہ مرا تیرہ سرانجامے ہست
بے تو گر زیستہ ام، سختیِ ایں درد بسنج
بگزر از مرگ کہ وابستہ ہنگامے ہست
مےِ صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تتار
ما ندانیم، کہ بغدادی و بسطامے ہست؟

—(۸۶)—

گیرم، ز داغِ عشقِ تو، طرفے نہ بست دل
اینم نہ بس بود کہ جگر روشناسِ کیست؟
از بیکسانِ شہرم و از ناکسانِ دہر
گر کشتۂ، سرِ تو سلامت! ہراسِ کیست؟

—(۸۷)—

آنکہ، بے پردہ، بصد داغِ نمایانم سوخت
دیدہ پوشید و گماں کرد کہ پنہانم سوخت

نہ بدر جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد
سوختم؛ لیک ندانم، بچہ عنوانم سوخت

سودم از ارزشم افزوں بود: آں خار و خسم
کز پے پشہ، تواں در چمنستانم سوخت

کردم از سنگ جگر، تا نشوم خستۂ عشق
ہم بداں سنگ بہم خوردنِ پیکانم سوخت

دیگر از خاتمۂ کفر چہ گویم، غالب؟
من کہ رخشندگیِ جوہرِ ایمانم سوخت

—(۸۸)—

در بذلِ لآلی، وَرقم دستِ کریمست
نے نے، نےِ کلکم رگِ مژگانِ یتیمست

رشحِ کفِ جم می چکد از مغزِ سفالم
سیرابیِ نقطم اثرِ فیضِ حکیمست

از آتشِ لہراسپ نشاں می دہد، امروز
سوزے کہ بجانکم، زتو، در عظمِ رمیمست

—(۸۹)—

افغانِ مرا بہشتیِ ساختۂ نیست
در زمزمۂ، بوے جگر سوختۂ ہست

در دیدہ، ز رخ پردہ برانداختۂ نیست
در سینہ، دو صد عربدہ اندوختۂ ہست

زاں سوے، بمیدانِ وفا تاختۂ نیست
زیں سو، ہوسِ جاں سپری توختۂ ہست

در راہِ ثوابش، قدِ افراختۂ نیست
در بزمِ عتابش، رخِ افروختۂ ہست

—(۹۰)—

بامن کہ عاشقم، سخن از ننگ و نام چیست؟
در امرِ خاص حجّتِ دستورِ عام چیست؟
مستم ز خونِ دل، کہ دو چشم ازاں پُراست
گوئی: ''مخور شراب'' و نہ بینی، بجام چیست
دلخستۂ غمیم و بود مے دواے ما
باخستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست؟

از کاسۂ کرام، نصیبست خاک را
تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست؟
نیکی ز تست؛ از تو نخواہیم مزدِ کار
ور خود بدیم، کارِ تو ایم؛ انتقام چیست؟
غالبؔ اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخِ مےِ لعل فام چیست؟

—(۹۱)—

چوں اصلِ کار در نظرِ ہمنشیں نبود
بیچارہ خردہ بر روشِ جستجو گرفت!
گفتم: ''خود از مشاہدہ بخشایش آورد''
خوش باد حالِ دوست کہ حالم نکو گرفت!
فرماں روا نہ گشت مسلماں بہیچ عصر:
گر رفت مغ ز میکدہ، ترسا فرو گرفت
رضواں چو شہد و شیر بہ غالبؔ حوالہ کرد
بیچارہ باز داد و مےِ مشک بو گرفت!

—(۹۲)—

غبارِ طرفِ مزارم بہ پیچ و تابے ہست
ہنوز، در رگِ اندیشہ اضطرابے ہست
بہانگِ صور، سر از خاک بر نمی دارم
ہنوز، در نظرم چشمِ نیم خوابے ہست
بہارِ ہند بود برشگال، ہاں! غالبؔ
دریں خزاں کدہ ہم، موسمِ شرابے ہست

—(۹۳)—

نہ ہرزہ، ہمچو نے، از مغزم استخواں خالیست
کہ جاے نالۂ زارے دریں میاں خالیست
روم بکعبہ ز کوے تو و ز حق خجلم
ز سجدہ جبہہ و از پوزشم زباں خالیست
خرابِ ذوقِ برو دوشِ کیستم، غالبؔ؟
کہ چوں ہلال، سراپایم از میاں خالیست

—(۹۴)—

شگافی ار جگرِ ذرّہ، نم بروں ندہد
بوادئی کہ مرا بار در ِگل افتادست
دریں روش، بچہ امید دل تواں بستن؛
میانۂ من و او شوق حایل افتادست
بہ صبر کم نیَم؛ اما عیارِ ایوبی
بقدرِ آں کہ گرفتند، کامل افتادست
بروے صیدِ تو، از ذوقِ استخوانِ تنش
ہما، ز تیزیِ پرواز، لبسمل افتادست
چو اندر آئنہ، با خویش لا بہ ساز شوی
زخود بجوے کہ ما را چہ در دل افتادست
حریفِ ما ہمہ بے بذلہ مَے خورد، غالبؔ
مگر ز خلوتِ واعظ بہ محفل افتادست؟

—(۹۵)—

ایمنیم از مرگ، تا تیغت جراحت بار ہست
روزیِ ناخوردۂ ما در جہاں بسیار ہست
ما و خاکِ رہ گزر بر فرقِ عریاں ریختن!
گل کسے جوید کہ او را گوشۂ دستار ہست

بر سرِ کوے تو، با مہرم بجنگ آرد ہمے
ایں ہجومِ ذرّہ کاندر روزنِ دیوار ہست
در پرستش ستم و در کام جوئی استوار:
بادشہ را بندۂ کم خدمتِ پُرخوار ہست
دور باش از ریزہ ہاے استخوانم، اے ہما!
کایں بساطِ دعوتِ مرغانِ آتش خوار ہست
کہنہ نخلِ تازہ از صرصر ز پا افتادہ ام
خاکم ار کاوی، ہنوزم ریشہ در گلزار ہست

—(۹٦)—

چشم از ابر اشکبار ترست
از عرق، جبہۂ بہار ترست
گریہ کرد از فریب و زارم گشت
نگہ از تیغ آبدار ترست
اے کہ خوے تو ہمچو روے تو نیست!
دیدہ از دل امیدوار ترست
خستہ از راہِ دور می آیم
پا ز تن پارۂ فگار ترست
شکوہ از خوے دوست نتواں کرد
بادۂ تند سازگار ترست

میرسد، گر بخویشتن نازد
غالبؔ از خویش خاکسار ترست

—(۹۷)—

ظهورِ بخششِ حق را ذریعه بے سببیست
وگرنه شرمِ گنه در شمارِ بے ادبیست

رموزِ دیں نشناسم درست، و معذورم
نهادِ من عجمی و طریقِ من عربیست

نشاطِ جم طلب از آسماں، نه شوکتِ جم
قدح مباش ز یاقوت، باده گر عنبیست

بود بطالعِ ما آفتابِ تحت الارض
فروغِ صبحِ ازل، در شرابِ نیم شبیست

نه هم پیالگی، زاهداں بلائے بود؟
خوشست، گر مےِ بیغش خلافِ شرع نبیست

عبودیت نکند اقتضاے خواهشِ کام
دعا بصیغهٔ امرست و امر بے ادبیست

میانِ غالبؔ و واعظ نزاع شد، ساقی
بیا به لابه؛ که هیجانِ قوتِ غضبیست

نشاطِ معنویاں از شرابخانۂ تست
فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست
بجام و آئنہ، حرفِ جم و سکندر چیست؟
کہ ہرچہ رفت بہر عہد، در زمانۂ تست
ہم از احاطۂ تست ایں کہ در جہاں ما را
قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست
سپہر را، تو بتاراجِ ما گماشتۂ
نہ ہرچہ دزد ز ما برد، در خزانۂ تست؟

﴿ ش ﴾

محوِ خودست، لیک نہ چوں من، دریں چہ بحث؟
او چوں خودی نداشتہ دشمن، دریں چہ بحث؟
افسانہ گوست غیر؛ چہ مہر افگنی برو؟
غم برنتابد ایں ہمہ گفتن؛ دریں چہ بحث؟
جیحون و نیل نیست، دلست؛ از خدا بترس!
گر نیست خونِ دیدہ بدامن، دریں چہ بحث!
بعد از حزیں، کہ رحمتِ حق بر روانش باد!
ما کردہ ایم پرورشِ فن؛ دریں چہ بحث؟

او جستہ جستہ غالبؔ و من دستہ دستہ ام
عرفیؔ کسیست، لیک نہ چوں من؛ دریں چہ بحث؟

﴿ ج ﴾

نقشم گرفتہ دوست؛ نمودن چہ احتیاج؟
آئینۂ مرا بزدودن چہ احتیاج؟
یاؔ پیرہن، ز ناز، فرو میرود بدل
بندِ قبائے دوست کشودن چہ احتیاج؟
چوں میتواں برہگزرِ دوست خاک شد
بر خاکِ راہ، ناصیہ سودن چہ احتیاج؟
در دستِ دیگریست، سفید و سیاہِ ما
با روز و شب، بعربدہ بودن چہ احتیاج؟

—(۱۰۱)—

جلوہ می خواہیم، آتش شو، ہوائے ما مسنج
دستگاہِ خویش بین و مدعائے ما مسنج
ہمنشیں! دارو دہ و دل در خدائے پاک بند
میروی از کار؛ دردِ بے دوائے ما مسنج
اے کہ نعشِ ما بری! پندارم، از ما بودۂ
دست مزدِ او چہ داری؟ خونبہائے ما مسنج

زاریِ ما در غمِ دل دید و شادی مرگ شد
مردنِ دشمن ز تاثیرِ دعاے ما مسنج
در گزر زیں پردہ چوں دمسازِ غالبؔ نیستی
مدعی! ہنجارِ خود گیر و نواے ما مسنج

﴿ چ ﴾

در پردہ شکایت ز تو داریم، و بیاں ہیچ
زخمِ دلِ ما جملہ دہانست، و زباں ہیچ
اے حسن! گر از راست نرنجی، سخنے ہست:
ناز ایں ہمہ، یعنی چہ؟ کمر ہیچ و دہاں ہیچ
عالم ہمہ مرآتِ وجودست؛ عدم چیست؟
تا کار کند چشم، محیطست و کراں ہیچ
در پردۂ رسوائیِ منصور نوائیست
رازت نشنودیم ازیں خلوتیاں ہیچ
غالبؔ، ز گرفتاریِ اوہام برون آی
باللہ! جہاں ہیچ و بد و نیکِ جہاں ہیچ

موجہ از دریا، شعاع از مہر، حیرانی چراست؟
محوِ اصلِ مدعا باش و بر اجزایش میچ
آسماں و ہمست؛ از برجیس و کیوانش مگوی
نقشِ ما ہیچست؛ بر پنہاں و پیدایش میچ
دل از آنِ تست و نعمتہاے الوانش تراست
سخت درہم، چوں سماطِ خوانِ یغمایش میچ
پیش ازیں کے بود؟ ایں ہم التفاتے بودہ است
اینقدر بر خود، ز رنجشہاے بیجایش، میچ
نعشِ غالبؔ ہمچنیں بر جا گزار؛ آخر شبست
خیز و در گُلہاے پرندِ گوہر آمایش میچ

﴿ ح ﴾

پیش ازیں، بادِ بہار ایں ہمہ سرمست نبود
شبنمِ ماست کہ تر کردہ دماغِ دمِ صبح
حقِ آں گرمیِ ہنگامہ کہ دارم بشناس
اے کہ در بزمِ تو ماتم بچراغِ دمِ صبح!

﴿ خ ﴾

اے جمالِ تو، بتاراجِ نظرہا، گستاخ!
وے خرامِ تو، بپامالیِ سرہا، گستاخ!
داغِ شوقِ تو، بہ آرایشِ دلہا، سرگرم!
زخمِ تیغِ تو، بہ گلگشتِ جگرہا، گستاخ!

—(۱۰۶)—

با تو شد ہمسخن، پیام گزار
چہ شکیبم بارزشِ پاسخ؟
قاصدِ من براہ مردہ و من
ہمچناں در شمارۂ فرسخ!
مرگِ غالبؔ دلت بدرد آورد
خویش را کشت و ہرزہ کشت، آوخ!

﴿ د ﴾

ز قاتلے بعذابم، کہ تیغ و خنجر را
بحکمِ وسوسہ، زہراب بے شگوں ندہد!

بمن گرای و وفا جو؛ که ساده برہمنم:
بسنگ ہرکہ دہد دل، بغمزہ چوں ندہد؟

—(۱۰۸)—

نگاہش ار بسرِ نامۂ وفا زیزد
سوادِ صفحہ ز کاغذ، چو توتیا، ریزد
بفرقِ ما اگرش ناگہاں گزار اُفتد
چو گرد، سایہ ز بال و پرِ ہما ریزد

—(۱۰۹)—

بہ بندِ پرسشِ حالم نمی تواں اُفتاد
تواں شناخت ز بندے کہ بر زباں اُفتاد
ہم از تصرفِ بیتابیِ زلیخا بود
بچاہِ یوسف، اگر راہِ کارواں اُفتاد

—(۱۱۰)—

غم چو بہم در افگند، رو کہ مراد میدہد:
دانہ ذخیرہ میکند، کاہ بباد میدہد
مستِ عطاے خود کند ساقیِ ما، نہ مستِ مے:
دادہ ز یاد میبرد، بسکہ زیاد میدہد

—(۱۱۱)—

دل، اسبابِ طرب گم کرده، در بندِ غمِ ناں شد
زراعت گاہِ دہقاں می شود، چون باغ ویراں شد
خدا را، اے بتاں! گردِ دلش گردیدنی دارد
دریغا آبروے دیر! گر غالبؔ مسلماں شد

—(۱۱۲)—

راز، از سینہ بمضراب نریزیم بیروں
سازِ عاشق، ز شکستن، بصدا می آید
رفتہ، در حسرتِ نقشِ قدمے، عمر بسر
جادۂ را کہ بسر منزلِ ما می آید

—(۱۱۳)—

خوشست آں کہ با خویش جز غم ندارد
ولے خوشترست آں کہ ایں ہم ندارد
گُلت را نوا، نرگست را تماشا:
تو داری بہارے کہ عالم ندارد

—(۱۱۴)—

مژدهٔ صبح دریں تیره شبانم دادند
شمع کشتند و ز خرشید نشانم دادند

رخ کشودند و لبِ هرزه سرایم بستند
دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

هرچه در جزیه ز گبراں مےِ ناب آوردند
بشبِ جمعهٔ ماهِ رمضانم دادند

هرچه از دستگهِ پارس به یغما بردند
تا بنالم، هم ازاں جمله زبانم دادند

—(۱۱۵)—

تاکیم، دودِ شکایت ز بیاں برخیزد؟
بزن آتش که شنیدن ز میاں برخیزد
می رمی از من و خلقے بگمانست ز تو
بیحابا شو و بنیش که گماں برخیزد
جزوے از عالمم و از همه عالم بیشم
همچو موئے که بتاں را ز میاں برخیزد

—(۱۱۶)—

گویم سخنے، گرچہ شنیدن نشناسد
صبحیست شبم را کہ دمیدن نشناسد
بے پردہ شو از ناز و میندیش؛ کہ ما را
چوں آئنہ، چشمیست کہ دیدن نشناسد
پیوستہ رواں از مژہ خونِ جگرستم
رنگیست رخم را کہ پریدن نشناسد

—(۱۱۷)—

ہردم، ز نشاطم، دلِ آزاد بجنبد
تا کیست دریں پردہ کہ بے باد بجنبد؟

—(۱۱۸)—

گم شد نشانِ من، چو رسیدم بکنجِ دیر
مانندِ آں صدا کہ بگوشِ گراں رسد
در دام بہرِ دانہ نیفتم؛ مگر قفس
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد
امیدِ غلبہ نیست، بکیشِ مغاں درآی
ے، گر بجزیہ دست نداد، ارمغاں رسد

—(۱۱۹)—

عاشق، چو گفتیش کہ "برو" زود میرود
نازم بخواجگی! غضب آلود میرود

از نالہ ام مرنج؛ کہ آخر شدست کار
شمعِ خموشم و ز سرم دود میرود

رشکِ وفا نگر، کہ بدعویٰ گہِ رضا
ہر کس چگونہ درپیِ مقصود میرود

فرزند زیرِ تیغِ پدر می نہد گلو
گر خود پدر در آتشِ نمرود میرود

—(۱۲۰)—

دانست کز شہادتم امیدِ حور بود
برگشتنم ز دیں، دمِ بسمل، ضرور بود

رفت آں کہ ما ز حسن مدارا طمع کنیم
سررشتہ، در کفِ "اَرِنی" گوے طور، بود

مجرم مسنج رندِ "اَنَاالحق" سراے را
معشوقہ خود نماے و نگہباں غیور بود

نازم باتمیاز کہ بگزشتن از گناہ
با دیگراں ز عفو و بما از غرور بود!

—(۱۲۱)—

ز گرمیِ نگہت، خونِ دل بجوش آمد
ز شادیِ ستمت، سینہ در خروش آمد
بجاں نوید کہ شرم از میانۂ ہم رفت!
بہ عیش مژدہ کہ وقتِ وداع ہوش آمد!
ز وصلِ یار قناعت، کنوں، بہ پیغامیست
خزانِ چشم رسید و بہارِ گوش آمد

—(۱۲۲)—

جاں، بر سرِ مکتوبِ تو، از شوق فشاندن
از عہدۂ تحریرِ جوابم بدر آورد

—(۱۲۳)—

گرسنہ بہ کہ برآید ز فاقہ جانش و لرزد
ازانکہ در رسد از راہ میہمانش و لرزد

نفس، بگردِ دل از مہر، می تپد بفراقت
چو طایرے کہ بسوزانی آشیانش و لرزد

—(۱۲۴)—

آنانکہ وصلِ یار ہمی آرزو کنند
باید کہ خویش را بگدازند و اُو کنند
وقتست کز روانیِ مے، ساقیانِ بزم
پیمانہ را حبابِ لبِ آبجو کنند
آلودۂ ریا نتواں بود، غالبا!
پاکست خرقۂ کہ بہ مَے شست و شو کنند

—(۱۲۵)—

چوں گویم، از تو بر دلِ شیدا چہ میرود؟
بنگر، بر آبگینہ ز خارا چہ میرود؟
گوئی: ''مباد! در شکنِ طرّہ خوں شود''
دل زانِ تست، از گرہِ ما چہ میرود؟
ہفت آسماں بگردش و ما در میانہ ایم
غالبؔ، دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

—(۱۲۶)—

نہ از شرمست کز چشمِ وے آساں بر نمی آید
نگاہش، با درازیہای مژگاں، بر نمی آید
سرت گردم! بزن تیغ و درے بر روے دل بکشا
دلم تنگست: کار از زخمِ پیکاں بر نمی آید
بدوشِ خلق نعشم، عبرتِ صاحبدلاں باشد
بپاے خود، کسے از کوے جاناں بر نمی آید

—(۱۲۷)—

چہ عیش از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نمی آید؟
بنوعے گفت: ''می آیم'' کہ میدانم نمی آید
گزشتم زانکہ بر زخمِ دلِ صد پارہ خوں گرید
خود او را خندہ، بر چاکِ گریبانم، نمی آید
براہِ کعبہ زادم نیست: شادم کز سبکباری
برفتن، پاے بر خارِ مغیلانم نمی آید
دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم: شیوہ ہا دارم
گرفتم، رحم بر فریاد و افغانم نمی آید

—(۱۲۸)—

چوں بپوئی بزمیں، چرخ زمینِ تو شود
خوش بہشتیست کہ کس راہ نشینِ تو شود!
چوں بسنجد کہ نہ آنست، بکاہد از شرم
ماہ یک چند ببالد کہ جبینِ تو شود

—(۱۲۹)—

دل در افروختنش منتِ دامن نکشید
شادم از آہ کہ ہم آتش و ہم باد آمد!
خیزد و در ماتمِ ما سرمہ فروشے ز چشم
وقتِ مشاطگیِ حسنِ خداداد آمد
بر درِ یار چہ غوغاست؟ عزیزاں، بروید
خونبہا مزدِ سبکدستیِ جلاد آمد

—(۱۳۰)—

دوش، کز گردشِ بختم گلہ، بر روے تو بود
چشم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود
آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بحتاب
نفسم پردہ کشاے اثرِ خوے تو بود

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند
کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروے تو بود
لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دلِ غالبؔ ہوسِ روے تو بود!

—(۱۳۱)—

گر چنیں نازِ تو آمادۂ یغما ماند
بہ سکندر نرسد، ہرچہ ز دارا ماند
در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالبؔ، امروز
مگزارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند!

—(۱۳۲)—

در کُلبۂ ما، از جگرِ سوختہ، بو برد
با ما گلہ سنجید و شماتت بعدو برد
یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دہ
تا تلخیِ آں زہر توانم ز گلو برد
نازد بہ نکویاں، ز گرفتاریِ غالبؔ
گوئی، بگرو برد دلے را کہ ازو برد

—(۱۳۳)—

نادان صنم من روشِ کار نداند
بر هر که کند رحم، سر از بار نداند
بے دشنہ و خنجر، نبود معتقدِ زخم
دلہاے عزیزاں، بغم افگار نداند
بر تشنہ لبِ بادیہ، سوزد دلش، از مہر
اندوہِ جگر تشنۂ دیدار نداند
دل را، بغم، آتشکدۂ راز نسنجد
دم را، بہ تفِ نالہ، شرربار نداند
دشوار بود مردن و دشوارتر از مرگ
آنست کہ من میرم و دشوار نداند!

—(۱۳۴)—

خوشم کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرقِ من فرو ریزد
ز جوشِ شکوۂ بیدادِ دوست می ترسم
مباد! مہرِ سکوت از دہن فرو ریزد
دہد بہ مجلسیاں بادہ و بہ نوبتِ من
بمن نماید و در انجمن فرو ریزد

مکن بہ پرسشم از شکوہ منع؛ کایں خونیست
کہ خود ز زخم، دمِ دوختن، فرو ریزد

—(۱۳۵)—

بوصل، لطف باندازۂ تحمّل کن
کہ مرگِ تشنہ بود، آب چوں ز سر گزرد
نفس، ز آبلہ ہاے دلم، برآرد سر
چناں کہ رشتہ، در آمودن، از گہر گزرد

—(۱۳۶)—

نیست وقتے کہ بما کاہشے از غم نرسد
نوبتِ سوختنِ ما بہ جہنم نرسد
خواجہ فردوس، بہ میراث، تمنا دارد
واے! گر در روشِ نسل بہ آدم نرسد
ہرکجا دشنۂ شوقِ تو جراحت بارد
جز خراشے، بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
طوبیِ فیضِ تو ہرجا گل و بار افشاند
جز نسیمے، بہ پرستش گہِ مریم نرسد

—(۱۳۷)—

آزاد کیست سازے، اما صدا ندارد
از ہرچہ در گزشتیم، آوازِ پا ندارد
اے سبزۂ سرِ رہ! از جورِ پا چہ نالی؟
در کیشِ روزگاراں، گل خونبہا ندارد
''برخویشتن بہ بخشا''، گفتم: دگر تو دانی
دارم دلے کہ دیگر تابِ جفا ندارد

—(۱۳۸)—

شوقم، ز پند، بر درِ فریاد می زند
بر آتشِ من، آب دم از باد می زند
ممنونِ کاوشِ مژہ و نیشتر نیم
دل موجِ خوں، ز دردِ خداداد، می زند

—(۱۳۹)—

''باید ز مے ہر آئینہ پرہیز''، گفتہ اند
آرے، دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند
خوں ریختن بکوے تو، کردارِ چشمِ ماست
مردم ترا برائے چہ خونریز گفتہ اند؟

—(۱۴۰)—

اے لالہ! بر دلے کہ سیہ کردۂ مناز
داغِ تو بر دماغِ کہ بوے کباب زد؟

—(۱۴۱)—

ننگِ فرہادم بفرسنگ از وفا دور افگند
عشقِ کافر، شغلِ جاں دادن بمزدور افگند!
چوں بجوید کام، تا لختے پرستاری کنم
خویش را بر رختِ خواب، از ناز، رنجور افگند
وقتِ کار، ایں جنبشِ خلخال کاندر ساقِ تست
حلقۂ رغبت بگوشِ خونِ منصور افگند

—(۱۴۲)—

برہ، با نقشِ پاے خویشم، از غیرت، سرے باشد
کہ ترسم، دوست جویاں را بکویش رہبرے باشد
چہ گویم سوزِ دل با چوں تو غم نادیدہ بدمستی
مثالے وا نمایم، گر کباب و اخگرے باشد
نخواہد بود رسم آنجا، بدیواں داوری بردن
گرفتم، کشورِ مہر و وفا را داورے باشد

مکیدم آں قدر کز بوسہ و دشنام خالی شد
لبِ یارست و حرفے چند، گو با دیگرے باشد

—(۱۴۳)—

دل نہ تنہا، ز فراقِ تو، فغاں ساز دہد
رفتنِ عکسِ تو از آئنہ آواز دہد
من سر از پا نشناسم برہِ سعی، و سپہر
ہردم انجامِ مرا جلوۂ آغاز دہد

—(۱۴۴)—

کو فنا؟ تا ہمہ آلایشِ پندار بَرَد
از صوَر جلوہ و از آئنہ زنگار برد
گفتہ باشی کہ ''بہر حیلہ در آتش فگنش''
غیر می خواست، مرا بے تو بگلزار برد
خونچکانست نسیم از اثرِ نالۂ من
کیست کز سعیِ نظر پے بدرِ یار برد؟

چاک از جیبم بداماں میرود
تا چہ بر چاک از گریباں میرود؟
جوہرِ طبعم درخشانست؛ لیک
روزم اندر ابر پنہاں میرود
بگور از دشمن؛ دلش سختست سخت
آبروے تیر و پیکاں میرود
کیست؛ تا گوید بداں ایواں نشین
آنچہ بر غالبؔ ز درباں میرود

—(۱۴۶)—

نومیدیِ ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد، سحر و شام ندارد
بے نقشِ وجودِ تو، سراپاے من، از ضعف
چوں بسترِ خوابست کہ اندام ندارد

—(۱۴۷)—

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جاں نبود؟
بریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود!

نگفتہ ام: "ستم از جانبِ خداست"؛ ولے
خدا، بہ عہدِ تو، بر خلق مہرباں نبود
ز خویش رفتہ ام و فرصتے طمع دارم
کہ باز گردم و جز دوست ارمغاں نبود
فرو برد نفسِ سردِ من جہنم را
اگر نشاطِ عطاے تو درمیاں نبود
بالتفاتِ نگارم، چہ جاے تہنیتست؟
دعا کنید کہ نوعے ز امتحاں نبود!

—(۱۴۸)—

بتانِ شہر ستم پیشہ شہریاراند
کہ در ستم روش آموزِ روزگاراند
برند دل بہ ادائے کہ کس گماں نبرد
فغاں! ز پردہ نشیناں کہ پردہ داراند
نہ زرع و کشت شناسند، نے حدیقہ و باغ
ز بہرِ بادہ، ہوا خواہِ باد و باراند
ز وعدہ گشتہ پشیماں و بہرِ دفعِ ملال
امیدوار بہ مرگِ امیدواراند

—(۱۴۹)—

دلستاناں بخِل اند، ارچہ جفا نیز کنند
از وفائے کہ نکردند، حیا نیز کنند
خستہ تا جاں ندہد، وعدۂ دیدار دہند
عشوہ، خواہند کہ در کارِ قضا نیز کنند
اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گزشت
کاش! با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند
از درختانِ خزاں دیدہ نباشم؛ کاینہا
ناز بر تازگیِ برگ و نوا نیز کنند
حلقِ غالبؔ نگر و دشنۂ سعدیؔ کہ سرود
''خوبرویانِ جفا پیشہ وفا نیز کنند''

—(۱۵۰)—

دماغِ اہلِ فنا نشاۂ بلا دارد
بفرقِم، ارّہ طلوعِ پرِ ہما دارد
کشادِ شستِ ادائے تو دلنشینِ منست
اگر خدنگِ تو در دل نشست، جا دارد
فغاں! کہ رحم بدآموزِ یار شد، غالبؔ
روا نداشت کہ بر ما ستم روا دارد

—(۱۵۱)—

نقاب دار کہ آئینِ رہزنی دارد
جمالِ یوسفی و فرِ بہمنی دارد
بباده گر بودم میل، شاعرم، نہ فقیہ
سخن چہ ننگ ز آلوده دامنی دارد؟

—(۱۵۲)—

ز رشک است ایں کہ در عشق آرزوے مردنم باشد
تو جانِ عالمی؛ حیف است گر جاں در تنم باشد
تو داری دین و ایمانے؛ بترس از دیو و نیرنگش
چو نبود توشۂ راہے، چہ باک از رہزنم باشد؟

—(۱۵۳)—

حورِ بہشتی ز یاد، آں بتِ کشمیر برد
بیمِ صراط از نہاد، آں دمِ شمشیر برد
شبرَوی غمزۂ، صبر و دل و دیں ربود
جاں، کہ ازرو باز ماند، شحنۂ تقدیر برد

—(۱۵۴)—

تا چند بلہوس مے، و عاشق ستم کشد؟
کو فتنہ؟ تا بداوریِ ہم علم کشد
دل را، بکارِ ناز چہ سرگرم کردۂ؟
یعنی بخویش ہم کند و از تو ہم کشد
صہبا حلال، زاہدِ شب زندہ دار را
اما بشرطِ آں کہ ہماں صبحدم کشد

—(۱۵۵)—

گفتند حور و کوثر و دادند ذوقِ کار
منعست نامِ شاہد و مے آشکار بُرد
نعشِ مرا بسوز؛ کم از برہمن نیَم
ننگِ نسوختن نتواں در مزار بُرد
پیشم ازاں پرس کہ پری و اہلِ کوے
گویند: "خستہ زحمتِ خود زیں دیار بُرد"

—(۱۵۶)—

بچشمِ مدعی، ہمچوں چراغِ روز، بے نورم
چراغم گر، بفرض از پرتوِ خرشید درگیرد

گمم درو ے؛ ز رشکست اینکہ غمخوارے نمی خواہم
کہ ترسم یابد او را ہر کہ از حالم خبر گیرد
سرت گردم! اگر پاے نزاکت درمیاں نبود
تنم، از لاغری، صد خردہ بر موے کمر گیرد

—(۱۵۷)—

تنکست دلم؛ حوصلۂ راز ندارد
آہ! از نےِ تیرِ تو کہ آواز ندارد
ہر دلشدہ، از دوست در اندازِ سپاسیست
مانا کہ نگاہِ غلط انداز ندارد

—(۱۵۸)—

لبم، از زمزمۂ یادِ تو، خاموش مباد!
غیرِ تمثالِ تو، نقشِ ورقِ ہوش مباد!
رہروِ بادیۂ شوق سبک سیرانند
بارِ سر نیز، دریں مرحلہ، بر دوش مباد!

—(۱۵۹)—

ہر ذرّہ را، فلک بزمیں بوس میرسد
گر خاک راست دعوی ناموس، میرسد

زینساں کہ خو گرفتۂ عاشق کیشست حسن
مر شمع را شکایتِ فانوس میرسد

خود پیشِ خود کفیلِ گرفتارِ منت
ہردم، پرسشِ دلِ مایوس میرسد

بیروں میا ز خانہ، بہ ہنگامِ نیمروز
رشک آیدم کہ سایہ بپابوس میرسد

—(۱۶۰)—

ازاں سرمایۂ خوبی، بوصلم کامِ دل جُستن
بداں ماند کہ مورے خرمنے را در کمیں باشد

نسوزد بر خودم دل، گر بسوزد برق خرمن را
کہ دانم آنچہ از من رفت، حقّ خوشہ چیں باشد

بہ پیرِ خانقہ، در روضہ یکجا خوش تواں بودن
بشرطِ آں کہ از ما بادہ و ز شیخ انگیں باشد

چہ رفت از زہرہ با ہاروت؟ خاکم در دہن بادا!
تو مریم باشی و کارِ تو با روح الامیں باشد
ازاں گردے کہ در راہش نشیند بر رخم، غالبؔ
چہ خیزد؟ چوں ہم از من رخ، ہم از من آستیں باشد

—(۱۶۱)—

از رشک کرد، آنچہ بمن روزگار کرد
در خستگی نشاطِ مرا دید، خوار کرد
بد کرد چوں سپہر بمن، گرچہ من بدم
باید بدیں حساب ز نیکاں شمار کرد
لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج
دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد
عمرے بہ تیرگی بسر آوردہ ام کہ مرگ
شادم بروشنائیِ شمعِ مزار کرد
نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بکفر
نومیدیم، دگر، بتو امیدوار کرد

—(۱۶۲)—

بذوقے سر، ز مستی، در قفائے رہرواں دارد
کہ، پنداری، کمندِ یار ہمچوں مار جاں دارد

''خدارا! وقتِ پرسش نیست''، گفتم: ''بگزر از غالب
کہ ہم جاں بر لب و ہم داستانہا بر زباں دارد

—(۱۶۳)—

صاحبدلست و نامور، عشقم بساماں خوش نکرد
آشوبِ پیدا ننگِ او، اندوہِ پنہاں خوش نکرد
آں خود ببازی می برد، ویں را دو جو می نشمرد
بنمودمش دیں، خندہ زد؛ آوردمش جاں، خوش نکرد
با من میاویز، اے پدر! فرزندِ آزر را نگر
ہرکس کہ شد صاحبِ نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

—(۱۶۴)—

قدرِ مشتاقاں چہ داند، دردِ ما چندش بود؟
آنکہ دایم کار با دلہاے خورسندش بود
شاہدِ ما ہمنشیں آرا و رنگیں محفلست
لاجرم، در بندِ خویشست آنکہ در بندش بود
غالبا! زنہار! بعد از ما، بخونِ ما مگیر
قاتلِ ما را کہ حاکم آرزومندش بود

—(۱۶۵)—

چرخ، ہر روزم، غمِ فردا بخوردن می دہد
تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کردہ اند

—(۱۶۶)—

کسے با من چہ، در صورت پرستی، حرفِ دیں گوید؟
ز آزر گفت، دانم، گر ز صورت آفریں گوید
شناسد جاے غم دل را و خود را دلربا داند
عجب دارد، اگر دلدادۂ خود را غمیں گوید
رہم افتادہ، بہرِ دانہ، سوے دامِ صیادے
کہ حرفِ ذبح با ہمرازِ خویش اندر کمیں گوید
گزارد آنچہ برق از خرمن، اندر دشت بگزارم
کہ ترسم، چوں بچینم، کس بطنزم خوشہ چیں گوید

—(۱۶۷)—

من بوفا مردم و رقیب بدرزد
نیمہ لبش انگبیں و نیمہ تبرزد
کیست دریں خانہ؟ کز خطوطِ شعاعی
مہر، نفس ریزہ ہا، بہ روزنِ در، زد

دعویٰ او را بود دلیل بدیہی
خندۂ دنداں نما، بہ حسنِ گہر، زد
کام نہ بخشیدہ، گنہ چہ شماری؟
غالبِ مسکیں بالتفات نیرزد

—(۱۶۸)—

بدیں قدر کہ لبے تر کنی و من بمکم
ترا ز بادۂ نوشیں چہ مایہ کم گردد؟
رسیدہ ایم بکوے تو؛ جاے آں دارد
کہ عمر صرفِ زمیں بوسیِ قدم گردد

—(۱۶۹)—

بیدل نشد، ار دل بہ بتِ غالیہ مو داد
گوئی، مگر آں دل کہ زمن برد، باو داد
سخت است دلِ غیر و گر از ننگ نگوئی
برگشتنِ مژگانِ تو گوید کہ چہ روداد
زیں سادہ دلی داد! کہ چوں دید بخوابم
ترسید خود و مژدۂ مرگم بعدو داد

نہم جبیں بدارش، آستاں بگرداند
نشینمش بسرِ رہ، عناں بگرداند
بزمِ بادہ، بہ ساقیگری، ازو چہ عجب
کہ پیرِ صومعہ را درمیاں بگرداند؟

—(۱۷۱)—

چو زہ، بقصدِ نشاں، بر کماں بجنباند
تپد ز رشک دلم، تا نشاں بجنباند
دعا کدام و چہ دشنام؟ تشنۂ سخنیم
بکامِ ماست زباں، چوں زباں بجنباند
ہنوز بیخبری زانکہ جبہہ بر درِ تو
نسودہ ایم چناں کاستاں بجنباند

—(۱۷۲)—

تیغت، ز فرق تا بگلویم، رسیدہ باد!
شوخی ز حد گزشت؛ زبانم بریدہ باد!

گر رفته ام ز کوے تو، آساں نرفته ام
ایں قصه از زبانِ عزیزاں شنیده باد!

—(۱۷۳)—

از تیرگیِ طرّۂ شبرنگ، نظرہا
پرواز، دراں صبحِ بناگوش، نکردند
گر داغ نہادند و گر درد فزودند
نازم، که به ہنگامه فراموش نکردند!
گر خود بغلامی نه پذیرند، گدا باش!
بر در بزن آں حلقه که در گوش نکردند

—(۱۷۴)—

تاجرِ شوق، بداں ره، بتجارت نرود
که ره انجامد و سرمایه بغارت نرود
تو، بیک قطرۂ خوں، ترکِ وضو گیری و ما
سیلِ خوں، از مژه رانیم و طہارت نرود
غالبِ خسته، بکوے تو، رہینِ تپشیست
که به شاہی نه نشیند، به وزارت نرود

بہ تے دارم، ز تشنگی، روزگاراں خو، بہاراں بر
بہ مستی، خویش را گرد آر و گوے از ہوشیاراں بر
ندارد شیر و خرما ذوقِ صہبا؛ رحم می آید!
نشاطِ عید، از ما ہدیہ سوے روزہ داراں، بر

—(۱۷۶)—

چہ جنون تازِ ہواے گل و خارست، بہار
کایں چنیں قطرہ زن از ابرِ بہارست، بہار
شوخیِ خوے ترا قاعدہ دانست، خزاں
خوبیِ روے ترا آئنہ دارست، بہار

—(۱۷۷)—

بیا و جوشِ تمناے دیدنم بنگر
چو اشک، از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر
ز من، بجرمِ تپیدن، کنارہ می کردی
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

شنیده ام که نه بینی، و ناامید نیم
ندیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر
دمید دانه و بالید و آشیاں گه شد
در انتظارِ هما، دام چیدنم بنگر
تواضعے نکنم بے تواضعے، غالبؔ
بسایۂ خمِ تیغش خمیدنم بنگر

—(۱۷۸)—

بمرگِ من! که پس از من، ز مرگِ من یاد آر!
بکوے خویشتن، آں نعشِ بے کفن یاد آر!
من آں نیم که ز مرگم جہاں بہم نخورد؛
فغانِ زاہد و فریادِ برہمن یاد آر!
ببام و در، ز ہجومِ جوان و پیر بگوی
بکوے و برزن، از اندوہِ مرد و زن یاد آر
خروش و زاریِ من، در سیاہیِ شبِ زلف
دمِ فتادنِ دل در چہِ ذقن، یاد آر
ہزار خستہ و رنجور در جہاں داری
یکے، ز غالبؔ رنجورِ خستہ تن یاد آر!

—(۱۷۹)—

بے دوست، ز بس، خاک فشاندیم بسر بر
صد چشمہ روانست، بداں راہگزر بر
غلتانیِ اشکم بود، از حسرتِ دیدار:
آبیست نگاہم کہ بہ پیچد بہ گہر بر
امید کہ خالِ رخِ شیریں شود، آخر
چشمے کہ سیہ ساختہ خسرو بہ شکر بر
بالد بخود آں مایہ کہ در باغ نہ گنجد
سروے کہ کشندش، بہ تمنائے تو، در بر
مطرب بہ غزل خوانی و غالبؔ بہ سماعست
ساقی، مے و آلاتِ مے از حلقہ بدر بر

—(۱۸۰)—

اے دل! از گلبنِ امید نشانی بمن آر
نیست گر تازہ گلے، برگِ خزانے بمن آر
تا، دگر، زخم بناسور تونگر گردد
ہدیۂ از کفِ الماس فشانے بمن آر
ہمدمِ روزِ گدائی! سبک از جا برخیزد
جاں گرو، جامہ گرو، رطلِ گرانے بمن آر

یارب! ایں مایہ وجود از عدم آوردۂ تست
بوسۂ چند ہم، از کنجِ دہانے، بمن آر

—(۱۸۱)—

بر دل، نفسِ غم! سرآور
چوں نالہ، مرا ز من برآور!
یا پایۂ آرزو بیفزای
یا خواہشِ ما ز در درآور!
عمرے، ز ہلاک تلخ تر، رفت
مرگے، ز حیات خوشتر، آور!

—(۱۸۲)—

اے ذوقِ نوانجی! بازم بخروش آور!
غوغاے شبیخونے، بر بنگہِ ہوش آور!
گر خود نجہد از سر، از دیدہ فروبارم؛
دل خوں کن وآں خوں را در سینہ بجوش آور!
گاہے، بسبکدستی، از بادہ ز خویشم بر!
گاہے، بہ سیہ مستی، از نغمہ بہوش آور!
غالب، کہ بقایش باد! ہمپاے تو گر ناید
بارے، غزلے فردی زاں موینہ پوش آور

در گریہ، از بس نازکی، رخ ماندہ بر خاکش نگر
واں سینہ سودن، از تپش، بر خاکِ نمناکش نگر
برقے کہ جانہا سوختے، دل از جفا سردش ببیں
شوخے کہ خونہا ریختے، دست از حنا پاکش نگر
آں کو بخلوت، با خدا ہرگز نکردے التجا
نالاں بہ پیشِ ہر کسے، از جورِ افلاکش نگر
بر آستانِ دیگرے، در شکرِ دربانش ببیں
در کوے از خود کمترے، در رشکِ خاشاکش نگر
خواند بہ امیدِ اثر، اشعارِ غالبؔ ہر سحر
از نکتہ چینی درگزر، فرہنگ و ادراکش نگر

﴿ ز ﴾

یارب! ز جنوں طرحِ غمے در نظرم ریز!
صد بادیہ، در قالبِ دیوار و درم، ریز!
از مہرِ جہانتاب، امیدِ نظرم نیست
ایں تشتِ پر از آتشِ سوزاں بسرم ریز!

هر خوں کہ عبث گرم شود، در دلم افگن
هر برق کہ بیصرفہ جهد، بر اثرم ریز!
گیرم کہ بہ افشاندنِ الماس نیرزم
مشتے نمکِ سودہ، برزخمِ جگرم ریز!

—(۱۸۵)—

اے شوق! بما عربدہ بسیار میاموز
ابرام بدریوزۂ دیدار میاموز
صورتکدہ شد کلبۂ من سر بسر، اے چشم!
انگیختنِ نقش ز دیوار میاموز

—(۱۸۶)—

خوں، قطرہ قطرہ، می چکد از چشمِ تر، هنوز
نکستہ ایم بخیۂ زخمِ جگر، هنوز
تا خود پس از رسیدنِ قاصد چہ رو دهد؟
خوش می کنم دلے بامیدِ خبر، هنوز

—(۱۸۷)—

یقینِ عشق کن و از سرِ گماں برخیز
بہ آشتی بہ نشیں یا بہ امتحاں برخیز
تو دودی، اے گلہ! کام و زباں نہ درخورِ تست
بدل فروشو و از مغزِ استخواں برخیز
رقیب یافتہ تقریبِ رخ بپا سودن
ترا کہ گفت کہ "از بزم سرگراں برخیز"؟
سبوچۂ دہمت ہر سحر ز مے، غالبؔ
خدائے را! ز سرِ کوچۂ مغاں برخیز

—(۱۸۸)—

با ہمہ گم گشتگی، خالی بود جایم، ہنوز
گاہ گاہے، در خیالِ خویش می آیم، ہنوز

﴿ س ﴾

داغِ تلخ گویانم، لذتِ سم از من پرس
محوِ تند خویانم، حیرتِ رم از من پرس

نیست با غنودنہا، برگِ پر کشودنہا
از عدم بروں آمد، سعیِ آدم از من پرس

تیغِ غمزہ با اغیار آنچہ کرد، میدانی
خنجرِ تغافل را تیزیِ دم از من پرس

خلد را نہادِ من؛ لطفِ کوثر از من جوے
کعبہ را سوادِ من؛ شورِ زمزم از من پرس

—(۱۹۰)—

کاشانہ نشیں عشوہ گرے را چہ کند کس؟
بے فتنہ سر رہ گذارے را چہ کند کس؟

گر سرخوشی از بادہ مرادست، بیاشام!
واعظ، تو و یزداں! خبرے را چہ کند کس؟

نایافتہ بارم، بہ نراندن چہ شکیبم!
گیرم کہ خود از تست، درے را چہ کند کس؟

—(۱۹۱)—

بے پردہ، تابِ محرمیِ رازِ ما مجوی
خوں گشتنِ دل، از مژہ و آستیں شناس

بے غم نہادِ مرد گرامی نمی شود
زنہار! قدرِ خاطرِ اندوہگیں شناس

—(۱۹۲)—

تیغ از نیام، بیہدہ، بیروں نکردہ کس
ما را بہیچ کشتہ و ممنوں نکردہ کس
یارب! بزاہداں چہ دہی خلد رایگاں؟
جورِ بتاں ندیدہ و دل خوں نکردہ کس

—(۱۹۳)—

رحمے از معشوق ہرجا در کتابے بنگری
بر کنارِ آں ورق ''جانہا فدایش'' می نویس

﴿ ش ﴾

دوشم، آہنگِ عشا بود کہ آمد در گوش
نالہ از تارِ ردائے کہ مرا بود بدوش
کاے خسِ شعلۂ آوازِ موذن! زنہار!
از پےِ گرمیِ ہنگامہ، منہ دل بخروش

حاصل آنست ازیں جملہ نبودن کہ مباش
ما نہ افسانہ سرائیم و تو افسانہ نیوش!
گفتم: ''از رنگ بہ بیرنگی اگر آرم روے
رہ دگر چوں سپرم؟'' گفت: ''زخود دیدہ بپوش''
جَستم از جاے، ولے ہوش و خرد پیشاپیش
رفتم از خویش، ولے علم و عمل دوشادوش
تا بہ بزمے کہ بیک وقت، درانجا دیدم
بادہ پیمودنِ امروز و بخوں خفتنِ دوش
ہمچو خرشید، کزو ذرہ درخشاں گردد
خوردہ ساقی مے و گردیدہ جہانے مدہوش
ہمہ محسوس بود ایزد، و عالم معقول
غالبؔ، ایں زمزمہ آواز نخواہد، خاموش!

—(۱۹۵)—

نیست معبودش حریفِ تابِ ناز آوردنش
پیشِ آتش دیدہ ام، روزے، نیاز آوردنش
تا خود از بہرِ نثارِ کیست؟ می میرم ز رشک،
خضر و چندیں کوشش و عمرِ دراز آوردنش
رحمتِ حق باد بر ہمدم! کہ داند، مستِ مست
بر سرِ نعشم، بہ تقریبِ نماز آوردنش

—(۱۹۶)—

بعرضِ شہرتِ خویش، احتیاجِ ما دارد
چو شعلۂ کہ نیاز اوفتد بہ خار و خسش
ز رنگ و بوے گل و غنچہ، در نظر دارم
غبارِ قافلۂ عمر و نالۂ جرسش
خوشم کہ دوست خود آنمایہ بیوفا باشد
کہ در گماں نسگالم امیدگاہِ کسش

—(۱۹۷)—

خوشا حالم! تن آتش، بستر آتش
سپندے کو؟ کہ افشانم بر آتش
ز رشکِ سینۂ گرمے کہ دارم
کشد، از شعلہ، بر خود خنجر، آتش

—(۱۹۸)—

دودِ سوداۓ تُتُق بست، آسماں نامیدمش
دیدہ برخوابِ پریشاں زد، جہاں نامیدمش
باد دامن زد بر آتش، نوبہاراں خواندمش
داغ گشت آں شعلہ از مستی، خزاں نامیدمش

بود در پہلو بہ تمکینی کہ دل می گفتمش
رفت از شوخی بآئینے کہ جاں نامیدمش

تا نہم بر روے سپاسِ خدمتے از خویشتن
بود صاحب خانہ، اما میہماں نامیدمش

بر امیدِ شیوۂ صبر آزمائی زیستم
تو بُریدی از من و من امتحاں نامیدمش

—(۱۹۹)—

ز لکنت، می تپد نبضِ رگِ لعلِ گہربارش
شہیدِ انتظارِ جلوۂ خویشست، گفتارش

ادائے لاابالی شیوہ مستے در نظر دارم
سرِ پرشورم، از آشفتگی، ماند بدستارش

بتے دارم کہ، گوئی، گر بروے سبزہ بخرامد
زمیں، چوں طوطیِ بسمل، تپد از ذوقِ رفتارش

وکالت کرد خواہم روزِ محشر کشتگانش را
نباشد، تا دراں ہنگامہ، جز بامن سروکارش

نہ از مہرست کز غالبؔ بمردن نیستی راضی
سرت گردم! تو میدانی کہ مردن نیست دشوارش

من و نظارهٔ روئے کہ وقتِ جلوہ، از تابش
همی بر خویشتن لرزد، پسِ آئینہ، سیمابش
بذوقِ بادہ، داغِ آں حریفِ دوزخ آشامم
کہ ہر جا بنگرد آتش، بگردد در دہن آبش
بہ فیضِ شرع، بر نفسِ مُزوّر یافتم دستے
چو آں دزدے کہ گیرد شحنہ ناگاہاں بمہتابش
ازین رختِ شراب آلودہ ات ننگ آیدم، غالبؔ
خدا را! یا بشو، یا بفگن اندر راہِ سیلابش

﴿ ص ﴾

چوں عکسِ پل بسیل، بذوقِ بلا برقص
جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص
ہم بر نوائے چغد، طریقِ سماع گیر
ہم در ہوائے جنبشِ بالِ ہما برقص
غالبؔ، بدیں نشاط کہ وابستۂ کہٖ
بر خویشتن ببال و بہ بندِ بلا برقص

ض

دل در غمش بسوز، کہ جاں میدہد عوض
ور جاں دہی، غمے بہ ازاں میدہد عوض

از ہرچہ نقشِ وہم و گمانست، درگزر
گو خود، بروں ز وہم و گماں میدہد عوض

پاداشِ ہر وفا بجفائے دگر کند
غالبؔ، بہ بیں کہ دوست چساں میدہد عوض

ط

گوئی کہ "ہاں! وفا؛ کہ وفا بودہ است شرط"
آرے، ہمیں ز جانبِ ما بودہ است شرط

تا نگزرم ز کعبہ، چہ بینم؟ کہ خود ز دیر
رفتن بکعبہ، رو بقفا بودہ است شرط

غالبؔ، بعالمے کہ توئی، خونِ دل بنوش
از بہرِ بادہ، برگ و نوا بودہ است شرط

تکیه بر عہدِ زبانِ تو غلط بود، غلط؛
کاں خود از طرزِ بیانِ تو غلط بود، غلط
آں کہ گفت، از منِ دلخستہ بہ پیشِ تو، رقیب
کہ ''غلط بود'' بجانِ تو! غلط بود، غلط
ایں مسلّم کہ لبِ ہیچ مگوئے داری
خاطرِ ہیچ مدانِ تو غلط بود، غلط
آخر، اے بوقلموں جلوہ! کجائی؟ کاینجا
ہرچہ دادند نشانِ تو، غلط بود، غلط

﴿ ظ ﴾

مرا کہ بادہ ندارم، ز روزگار چہ حظ؟
ترا کہ ہست و نیاشامی، از بہار چہ حظ؟
خوشست کوثر و پاکست بادۂ کہ دروست
از آں رحیقِ مقدس، دریں خمار چہ حظ؟
بذوقِ بے خبر از در درآمدن محوم
بوعدہ ام چہ نیاز و ز انتظار چہ حظ؟

—(۲۰۶)—

تا رغبتِ وطن بود، از سفر چه حظ؟
آنرا که نیست خانه به شہر، از خبر چه حظ؟
تا فتنہ در نظر نہ نہی، از نظر چه سود؟
تا دشنہ بر جگر نخوری، از جگر چه حظ؟
باید نبشت نکتۂ غالبؔ بآبِ زر:
''بے آنکہ وجہِ می شود، از سیم و زر چه حظ؟''

﴿ ع ﴾

جاں بناموس دہے چند فراہم شده اند؛
ورنہ خود با تو چہ بودست، رگِ گردنِ شمع؟
روزم، از تیرگی، آں وسوسہ ریزد بنظر
کہ شبِ تار، بہ ہنگامِ فرو مردنِ شمع

—(۲۰۸)—

شادم کہ بر انکارِ من، شیخ و برہمن گشتہ جمع
کز اختلافِ کفر و دیں، خود خاطرِ من گشتہ جمع

اے آنکہ بر خاکِ درش تنہاے بیجاں دیدۂ!
بر گوشۂ بامش، نگر، جانہاے بے تن گشتہ جمع
صحبت و گوناگوں اثر، غالبؔ، چہ خسپی بیخبر
نیکاں بہ مسجد رفتہ در، رنداں بگلشن گشتہ جمع

﴿ غ ﴾

بخوں تپم بسرِ رہگزر، دروغ، دروغ!
نشاں دہم بہ رہت صد خطر، دروغ، دروغ!
طراوتِ شکنِ جیب و آستینت کو؟
ز نامہ دم مزن، اے نامہ بر! دروغ، دروغ!

—(۲۱۰)—

ہنگام بوسہ، بر لبِ جاناں خورم دریغ
در تشنگی، بہ چشمۂ حیواں خورم دریغ
زیں دود و زیں شرارہ کہ در سینۂ منست
سازم سپہر، گر نہ بساماں خورم دریغ

ف

گل و شمعم، بمزارِ شہدا گشت تلف
نشدی راضی و عمرم بدعا گشت تلف

آمدی دیر بہ پرسش؛ چہ بشارت آرم؟
من و عمرے کہ باندوہِ وفا گشت تلف!

گیرم، امروز دہی کامِ دل؛ آن حسن کجا؟
اجرِ ناکامیِ سی سالۂ ما گشت تلف

—(۲۱۲)—

اے کردہ غرقم بیخبر! شو زیں نشانہا یک طرف
رختم بساحل یک طرف، شستم بدریا یک طرف

از عشق و حسنِ ما و تو، با ہمدگر در گفتگو
خسرو بہ مجنوں یک طرف، شیریں بہ لیلیٰ یک طرف

اے آئنہ پیشِ نظر، مستانہ بر خود جلوہ گر!
رحمے بجانِ خویش کن، غمخواریِ ما یک طرف!

ق

براہِ شوق، بر آں آب، خوں ہمی گریم
کہ قطرہ قطرہ، چو ابرم، چکیدہ از ابریق
ترا بہ پہلوے میخانہ جا دہم، غالب
بشرطِ آں کہ قناعت کنی ببوے رحیق

—(۲۱۴)—

بہ بزمِ بادہ، گریباں کشودنش نگرید
خوشا بہانۂ مستی! خوشا رعایتِ شوق!
بخود مناز و بہ آموزگاریم بپذیر
من و نہایتِ عشق و تو و بدایتِ شوق!

ک

مُرد آنکہ در ہجومِ تمنا شودِ ہلاک
از رشکِ تشنۂ کہ بدریا شود ہلاک
نازم بہ کشتۂ کہ چو یابد دوبارہ عمر
در عذرِ التفاتِ مسیحا شود ہلاک!

با خضر گر نمی روم، از بیم ناکسیست
ترسم، ز ننگِ همرہیِ ما شود ہلاک

—(۲۱۶)—

بحر اگر موجزنست، از خس و خاشاک چہ باک؟
با تو، ز اندیشہ چہ اندیشہ، و از باک چہ باک؟
وحشتے نیست، اگر خانہ چراغے دارد
با دل، از تیرگیِ زاویۂ خاک، چہ باک؟

—(۲۱۷)—

سبک روحم؛ بوَد بارِ من اندک
چرا نشماری آزارِ من اندک؟
ازیں پرسش کہ بسیارست از تو
شد اندوہِ دلِ زارِ من اندک
مداں کز دست بُردِ تست، گر ہست
متاعِ صبر در بارِ من اندک
وجودم خوانِ یغما بود غم را
تو ہم بردی ز بسیارِ من اندک

گ

اے ترا و مرا، دریں نیرنگ
دہن و چشم و دست و دل ہمہ تنگ!
شکوہ و شکر، ہرزہ و باطل
غالبؔ و دوست، آبگینہ و سنگ

ل

نہ مرا دولتِ دنیا، نہ مرا اجرِ جمیل
نہ چو نمرود توانا، نہ شکیبا چو خلیل
با رقیباں، کفِ ساقی، بمےِ ناب کریم
با غریباں، لبِ جیحوں، بدمے آب بخیل
اے بہ مسمارِ قضا، دوختہ چشمِ ابلیس
بدمِ گرم رواں، سوختہ بالِ جبریل!
با تو ام، خرمیِ خاطرِ موسیٰ و طور
با خودم، خستگیِ لشکرِ فرعون بہ نیل
بر کمالِ تو، در اندازہ، کمالِ تو محیط
بر وجودِ تو، در اندیشہ، وجودِ تو دلیل

نہ کنی چارہ، لبِ خشکِ مسلمانے را؟
اے بہ ترسا بچگاں کردہ میِ ناب سبیل!

—(۲۲۰)—

راہیست کہ در دل فتد، ار خوں رود از دل
ناید بزباں شکوہ و بیروں رود از دل
با من سخن از سستیِ اوہام سراید
کمِ خرمیِ فالِ ہمایوں رود از دل
شخصش، بخیالم نزند پاپچہ بالا
ہرچند، ز جوشِ ہوسم، خوں رود از دل
زاں شعر کہ در شکوۂ خوے تو سرایم
لفظم بزباں ماند و مضموں رود از دل

—(۲۲۱)—

گفتم: ''ز شادی، نبودم گنجیدن آساں در بغل''
تنگم کشید، از سادگی، در وصل جاناں در بغل!
نازم خطر ورزیدنش، واں ہرزہ دل لرزیدنش:
چینے ببازی بر جبیں، دستے بدستاں در بغل!

دانش بے در باختہ، خود را ز من نشناختہ
رخ، در کنارم ساختہ، از شرم، پنہاں در بغل!
گاہم بہ پہلو خفتہ خوش، بستے لب از حرف و سخن
گاہم ببازو ماندہ سر، سودے زنخداں در بغل!
ہاں! غالبِ خلوت نشیں، بیمے چناں عیشے چنیں:
جاسوسِ سلطاں در کمیں، مطلوبِ سلطاں در بغل!

—(۲۲۲)—

تا گل برنگ و بوے کہ ماند؟ کہ در چمن
گل در پسِ گل آمدہ در جستجوے گل
زانگہ کہ عندلیب لقب دادۂ مرا
افزودۂ امیدِ من و آبروے گل

—(۲۲۳)—

تن بر کرانہ ضایع، دل در میانہ غافل
چوں غرقۂ کہ ماند رختش بسوے ساحل
داغم، بشعلہ زائی، اندازِ برقِ خاطف
سعیم، بنارسائی، پروازِ مرغِ بسمل
رازِ تو، در نہفتن، تبخالہ ریخت بر لب
تیرِ تو، در گزشتن، پیکاں گداخت در دل

با من، نمودہ مجنوں بیعت، بہ فنِ سودا
بر تو، فشاندہ لیلیٰ زیور، ز طرفِ محمل

﴿ م ﴾

رفتم، کہ کہنگی ز تماشا برافگنم
در بزمِ رنگ و بو، نمطی دیگر افگنم
ہنگامہ را، جحیمِ جنوں بر جگر زنم
اندیشہ را، ہوائے فسوں در سر افگنم
نخلم کہ ہم، بجائے رطب، طوطی آورم
ابرم کہ ہم، بروے زمیں، گوہر افگنم
ضعفم، بکعبہ مرتبۂ قربِ خاص داد:
سجادہ گستری تو و من بستر افگنم

—(۲۲۵)—

بسکہ بہ پیچید بہ خویش، جادہ، ز گمراہیم
رہ بدرازی دہد، عشوۂ کوتاہیم

دور فتادم ز یار؛ ماہیِ بے دجلہ ام
نیست دلم در کنار؛ دجلۂ بے ماہیم
بندۂ دیوانہ ام، مخطی و ساہی خوشم:
حکم ترا مخطیم، قہرِ ترا ساہیم

—(۲۲۶)—

بو، کہ بہ حشو بشنوی قصۂ ما و مدعی
تازہ ز رویدادِ شہر، طرحِ فسانہ کردہ ایم
بادہ بوام خوردہ و زر بقمار باختہ
وہ! کہ ز ہر چہ ناسزاست، ہم بسزا نہ کردہ ایم

—(۲۲۷)—

معنیِ بیگانۂ خویشم، تکلّف برطرف!
چوں مہِ نو، مصرعِ تاریخِ ایجادِ خودم
گر فراموشی بفریادم رسد، وقتست، وقت
رفتہ ام از خویشتن چندانکہ در یادِ خودم
می دہم دل را، ز بیدادت، فریبِ التفات
سادگی بنگر، کہ در دامِ تو صیّادِ خودم!

—(۲۲۸)—

یاد باد آں روزگارے کاعتبارے داشتم:
آہِ آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتم
آفتابِ روزِ رستاخیز یادم میدہد
کاندراں عالم، نظر بر تابسارے داشتم
تا کدامیں جلوہ، زاں کافر ادا می خواستم؟
کز ہجومِ شوق، در وصل انتظارے داشتم
خوے تو دانستم؛ اکنوں بہرِ من زحمت مکش
رام بودم، تا دلِ امیدوارے داشتم
دیگر، از خویشم خبر نبود؛ تکلّف برطرف!
ایں قدر دانم کہ غالبؔ نام یارے داشتم

—(۲۲۹)—

دیدم آں ہنگامہ؛ بیجا خوفِ محشر داشتم
خود ہماں شور است، کاندر زیست، در سر داشتم
تا چہ سنجم دوزخ و کوثر؟ کہ من نیز، ایں چنیں
آتشے در سینہ و آبے بساغر داشتم
دوش، بر من عرض کردند آنچہ در کونین بود
زاں ہمہ کالاے رنگارنگ، دل برداشتم

کور بودم کز حرم راندند، رفتم سوے دیر
از جمالِ بت سخن می رفت، باور داشتم

—(۲۳۰)—

ایں چہ شورے است کہ، از شوقِ تو، در سر دارم؟
دلِ پروانہ و تمکین سمندر دارم
پرتوِ مہر، سیاہی ز گلیمم نہ برد
سایہ ام، سایہ: شب و روز برابر دارم

—(۲۳۱)—

شبہاے غم، کہ چہرہ بہ خوناب شستہ ایم
از دیدہ، نقشِ وسوسۂ خواب شستہ ایم
پیمانہ را ز بادہ، بہ خوں، پاک کردہ ایم
کاشانہ را ز رخت، بہ سیلاب، شستہ ایم
غرقِ محیطِ وحدتِ صرفیم و در نظر
از روے بحر، موجہ و گرداب شستہ ایم
تردامنی، نصیبِ کس از اہلِ دیں مباد!!
مائیم و لوثِ بادہ کہ بے آب شستہ ایم!

—(۲۳۲)—

بخت در خوابست، می خواہم کہ بیدارش کنم
پارۂ غوغاے محشر کو؟ کہ در کارش کنم
با تو عرضِ وعدہ ات، حاشا! کہ از ابرام نیست
ہرچہ میگوئی، ہمی خواہم کہ تکرارش کنم

—(۲۳۳)—

دل با حریف ساختہ و ما، ز سادگی
بر مدعاے خویش، گواہش گرفتہ ایم
از چشمِ ما، خیالِ تو بیروں نمی رود
گوئی، بدامِ تارِ نگاہش گرفتہ ایم

—(۲۳۴)—

تا فصلے، از حقیقتِ اشیا، نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
ایماں بغیب، تفرقہا رفت از ضمیر
ز اسما گزشتہ ایم و مسمّٰی نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ، معنیِ لفظِ امید نیست
فرہنگ نامہاے تمنا نوشتہ ایم

آیندہ و گزشتہ، تمنا و حسرتست
یکِ ''کاشکے'' بود، کہ بصد جا نوشتہ ایم
غالبؔ، الف ہماں علمِ وحدتِ خودست
بر ''لا'' چہ برفزود، گر ''اِلّا'' نوشتہ ایم؟

—(۲۳۵)—

صبحست، خیز، تا نفسے در ہم افگنم
از نالہ، لرزہ درِ فلکِ اعظم افگنم
آتش فرونشاند، نمِ دامنم؛ بیا
کایں دلقِ نیم سوختہ در زمزم افگنم
خوشنودم از تو و ز پےِ دور باشِ خلق
آوازۂ جفاے تو در عالم افگنم
دوزند گر، بفرض، زمیں را بہ آسماں
حاشا! کزیں فشار، در ابرو خم افگنم

—(۲۳۶)—

بے پردگیِ محشرِ رسوائی، خویشم
در پردۂ یک خلق، تماشائیِ خویشم

نقشِ بضمیرِ آمدهٔ نقش طرازم
حاشا! کہ بود دعویٔ پیدائیِ خویشم

—(۲۳۷)—

گم گشتہ بکوے تو، نہ دل، بلکہ خبر ہم
در لرزہ ز خوے تو، نہ دم، بلکہ اثر ہم
یا رب! چہ بلائے؟ کہ دمِ عرضِ تمنا
اجزاے نفس می خزد، از بیمِ تو، درہم
تا حسن، بہ بے پردگیِ جلوہ، صلا زد
دیدیم کہ تارے ز نقابست نظر ہم

—(۲۳۸)—

رنگہا، چوں شد فراہم، مصرفے دیگر نداشت
خلد را نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کردہ ایم
زاہد، از ما خوشۂ تاکے، بہ چشمِ کم مبیں
ہے! نمیدانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

—(۲۳۹)—

ہم بہ عالم، ز اہلِ عالم بر کنار افتادہ ام
چوں امامِ سُبحہ، بیروں از شمار افتادہ ام
ریزم، از وصفِ رخت، گل را شرر در پیرہن
آتشِ رشکم؛ بجانِ نوبہار افتادہ ام

کشتیِ بے ناخدایم، سرگزشتِ من مپرس
از شکستِ خویش، بر دریا کنار افتادہ ام
از روانیہاے طبعم، تشنۂ خونست دہر
آبم، آب؛ اما، تو گوئی، خوشگوار افتادہ ام

—(۲۴۰)—

سوخت جگر، تا کجا رنجِ چکیدن دہیم؟
رنگ شو، اے خونِ گرم! تا پریدن دہیم
جلوہ غلط کردہ اند؛ رخ بکشا، تا ز مہر
ذرّہ و پروانہ را، مژدۂ دیدن دہیم
دامن، از آلودگی، سخت گراں گشتہ است
وہ! کہ در آرد ز پا، بہ! کہ بچیدن دہیم

—(۲۴۱)—

بود بدگو سادہ، با خود ہمزبانش کردہ ام
از وفا آزردنت، خاطر نشانش کردہ ام
بر امیدِ آنکہ اختر درگزر باشد مگر
ہرزہ میگویم کہ "بر خود مہربانش کردہ ام"

گوشۂ چشمش، بہ بزمِ دلربایاں، با منست
وقتِ من خوش باد! کز خود بدگمانش کردہ ام
در طلب، دارم تقاضائے کہ گوئی، در خیال
بوسہ تحویلِ لبِ شکّر فشانش کردہ ام

—(۲۴۲)—

می ربایم بوسہ و عرضِ ندامت می کنم
اختراعے چند، در آدابِ صحبت می کنم

—(۲۴۳)—

صبح شد، خیز، کہ رودادِ اثر بنمایم:
چہرہ، آغشتہ بخونابِ جگر، بنمایم
پنبہ یکسو نہم از داغ، کہ رخشد چوں روز
آخرے نیست شبم را کہ سحر بنمایم
می کند ناز، گماں کردہ کہ خط دیر دمد
خیز، تا شعبدۂ جذبِ نظر بنمایم
چوں بہ محشر، اثرِ سجدہ ز سیما جویند
داغِ سودائے تو، ناچار، ز سر بنمایم

—(۲۴۴)—

گاہ، گاہ، از نظرم مست و غزلخواں بگزر؛
ورنہ بر عہدۂ من نیست کہ رسوا باشم
با دلِ چوں تو ستم پیشہ، داور نشناس
چکنم، گر ہمہ اندیشۂ فردا باشم؟
ہمچو آں قطرہ کہ بر خاک فشاند ساقی
دورم ام کُنجِ لبت، گر ہمہ صہبا باشم

—(۲۴۵)—

دگر، نگاہِ ترا مستِ ناز می خواہم
حسابِ فتنہ، ز ایّام باز می خواہم
گزشتم از گلہ، در وصل فرصتم بادا!
زبانِ کوتہ و دستِ دراز می خواہم
وکیلِ غالبِ خونیں دلم؛ سفارش نیست
بشکوۂ تو، زباں را مجاز می خواہم

—(۲۴۶)—

ز من حذر نہ کنی، گر لباسِ دیں دارم
نہفتہ کافرم و بُت در آستیں دارم

نشستہ ام، بگدائی، بشاہراہ و ہنوز
ہزار دزد، بہر گوشہ، در کمیں دارم
ترا نہ گفتم اگر جان و عمر، معذورم؛
کہ من، وفاے تو با خویشتن، یقیں دارم

—(۲۴۷)—

بیا، کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا، بہ گردشِ رطلِ گراں، بگردانیم
ز چشم و دل، بہ تماشا، تمتع اندوزیم
ز جان و تن، بہ مدارا، زیاں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار، نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں، بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم
بکاروبار، زنے کارداں بگردانیم
نہیم شرم بہ یکسوے و باہم آویزیم
بشوخیے کہ رخِ اختراں بگردانیم

—(۲۴۸)—

رفت بر ما، آنچه خود ما خواستیم
وایه از سلطاں، بغوغا، خواستیم
رفت و باز آمد ہما، در دامِ ما
باز سر دادیم و عنقا خواستیم
ہم بخواہش، قطعِ خواہش خواستند
عذرِ خواہشہاے بیجا خواستیم

—(۲۴۹)—

اگر بر خود نمی بالد، ز غارت کردنِ ہوشم
مر او را، از چہ دشوارست، گنجیدن در آغوشم؟
نیرزم ہیچ: چوں لفظِ مکرر ضایعم، ضایع
مگر کز لک کشد دستِ نوازش بر سر و دوشم
مرنج از وعدۂ وصلے، کہ با من درمیان آری
کہ خواہد شد، بذوقِ وعدۂ دیگر، فراموشم
اداے مے بساغر کردنت نازم! زہے ساقی!
بیفشاں جرعہ بر خاک و ز من بگزر کہ مدہوشم

—(۲۵۰)—

وحشتے در سفر، از برگِ سفر، داشتہ ایم
توشۂ راہ، دلے بود کہ برداشتہ ایم
تو دماغ، از مےِ پرزور، رسانیدہ و ما
بر درِ میکدہ، خشتےِ تہِ سر داشتہ ایم
وا رسیدیم؛ کہ، غالبؔ، بمیاں بود نقاب
کاش! دانیم کہ از روے کِہ برداشتہ ایم

—(۲۵۱)—

خواہی فراغِ خویش، بیفزاے بر ستم
تا، در عوض، ہماں قدر از شکوہ کم کنم
طفلست و تندخوے: بہ بینم، چہ می کند؟
رامم؛ ولے بعربدہ، دانستہ رم کنم
تا دخلِ من بعشق فزوں تر بود ز خرج
خواہم کہ از تو بیش کشم ناز و کم کنم

—(۲۵۲)—

نہ از مہر ست، گر بر داستانم می نہد گوشے
ہماں از نکتہ چینی، خیزدش ذوقِ شنیدن ہم

چہ پرسی، کز لبت وقتِ قدح نوشی، چہ می خواہم؟
ہمیں بوسیدنی؛ چوں مست تر گردی، مکیدن ہم!
سرت گردم! شکارِ تازہ گر ہر دم ہوس داری
بہر بندم، رہا میکن بقدرِ یک رمیدن ہم

—(۲۵۳)—

آنم کہ لبِ زمزمہ فرسائے ندارم
در حلقۂ سوہاں نفساں، جائے ندارم
خود رشتہ زند موجِ گہر؛ گرچہ من اکنوں
جز رعشہ، بدستِ گہر آمائے ندارم
نازِ تو فراواں بود و صبرِ من اندک
تو دست و دلے داری و من پائے ندارم

—(۲۵۴)—

پرسد سببِ بیخودی از مہر و من، از بیم
در عذر، بخوں غلتم و گفتار ندانم
زخمِ جگرم؛ بخیہ و مرہم نہ پسندم
موجِ گہرم؛ جنبش و رفتار ندانم
غالب، نبود کوتہی از دوست، ہمانا
زانساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

نامہ بر گم شد، در آتش نامہ را باز افگنم
چوں کبوتر نیست، طاؤسے بپرواز افگنم
ترکِ صحبت کردم و در بندِ تکمیلِ خودم
نغمہ ام جاں گشت، خواہم در تنِ ساز افگنم

﴿ ن ﴾

اے ز سازِ زنجیرم، در جنوں نوا گر کن!
بند، گر بدیں ذوقست، پارۂ گراں تر کن
فیضِ عیشِ نوروزی جاودانہ خوش باشد
روزِ من، ز تاریکی، با شمم برابر کن
''کن''، بپارسی گفتی، سازِ مدعا کردم
ہم بخویش، در تازی، گفتہ را مکرر کن
از دروں، روانم را در سپاسِ خویش آور
وز بروں، زبانم را شکوہ سنجِ اختر کن
بخششِ خداوندی، گر فراخورِ ظرفست
ہم بہوش بیشی دہ، ہم بہ مے تونگر کن

—(۲۵۷)—

ہا! پری شیوہ غزالاں و ز مردم رمِ شاں
دلِ مردم بخمِ طرۂ خم در خمِ شاں
کافرانند جہاں جوے، کہ ہرگز نبود
طرۂ حور دلاویزتر از پرچمِ شاں
رشک بر تشنۂ تنہا روِ وادی دارم
نہ بر آسودہ دلانِ حرم و زمزمِ شاں

—(۲۵۸)—

گرفتم، کے بشرعِ ناز، زارم میتواں کشتن؟
بہ فتواے دلِ امیدوارم میتواں کشتن

بجرمِ ایں کہ در مستی، بپایاں بردہ ام عمرے
بکوے مے فروشاں، در خمارم میتواں کشتن

جفا بر چوں منے کم کن؛ کہ گر کشتن ہوس باشد
بذوقِ مژدۂ بوس و کنارم میتواں کشتن
بخونِ من، اگر، تنگست دست و خنجر آلودن
نویدِ وعدۂ؛ کز انتظارم میتواں کشتن

—(۲۵۹)—

زہے! باغ و بہارِ جاں فشاناں
غمت، چشم و چراغِ رازداناں
بصورت، اوستادِ دلفریباں
بمعنی، قبلۂ نامہربانان
وصالت، جاں توانا سازِ پیراں
خیالت، خاطر آشوبِ جواناں
ز ناحق کشتگاں راضی، بجانت!
کہ غالبؔ ہم یکے باشد از آناں

—(۲۶۰)—

طاق شد طاقت، ز عشقت بر کراں خواہم شدن
مہرباں شو؛ ورنہ بر خود مہرباں خواہم شدن
خار و خس ہر گہ در آتش سوخت، آتش می شود
مُردم از ذوقِ لبت، چنداں کہ جاں خواہم شدن
بسکہ فکرِ معنیِ نازک ہمی کاہد مرا
شاہدِ اندیشہ را موے میاں خواہم شدن

—(۲۶۱)—

دل، زاں مژهٔ تیز، بیک بار کشیدن
دامن، بدرشتی بود از خار کشیدن
دارم سرِ ایں رشتہ بدانساں کہ ز دیرم
تا کعبہ، تواں بردَ بزنارَ کشیدن
حق گویم و ناداں بزبانم دہد آزار
یارب! چہ شد آں فتوی بردار کشیدن؟
من کافرِ زنہاریِ شاہم؛ بمن ارزد
مے، در رمضاں، بر سرِ بازار کشیدن

—(۲۶۲)—

واعظ، سخن از توبہ مگو، اینکہ پس از مے
دست و دہنے آب کشیدیم، بست ایں
لب بر لبِ دلبر نہم و جاں بسپارم
ترکیبِ یکے کردنِ صد ملتمس ست، ایں

—(۲۶۳)—

بسکہ لبریزست، ز اندوہِ تو، سر تا پاے من
نالہ می روید، چو خارِ ماہی، از اعضاے من
دامنش در انتظارِ غیر و نالم زار، زار
واے من! گر رفتہ باشد خوابش، از غوغاے من

خاطرِ منّت پذیر و خوے نازک دادهٔ
گر بہ بخشی، شرمسارم، ور نہ بخشی، واے من!

—(۲۶۴)—

خوش بود، فارغ ز بندِ کفر و ایماں زیستن
حیف! کافر مردن و آوخ! مسلماں زیستن

شیوهٔ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
این قدر دانم کہ دشوارست آساں زیستن

—(۲۶۵)—

چیست، بہ لب خنده، از عتاب، شکستن؟
رونقِ پرویں، ز آفتاب، شکستن

شانہ براں طرهٔ سیاه کشیدن
قیمتِ کالاے مشکناب کشیدن

جوششِ سرمستیم، ز برق پسندد
نیشتر اندر رگِ سحاب شکستن

طره میارا برغمِ خواہشِ غالبؔ
چیست دلش را، ز پیچ و تاب، شکستن؟

—(۲۶۶)—

خیره کند مرد را مهرِ درم داشتن
حیف! ز ہیچو خودے، چشمِ کرم داشتن

وائے! ز دل مردگی، خوے بد انگیختن
آہ! ز افسردگی، روے دژم داشتن

بهرِ فریب، از ریا، دامِ تواضع مچیں؛
دل نربایذ ہمی تیغ، ز خم داشتن

اشک چنان بے اثر، نالہ چنین نارسا!
دیدہ و دل را سزد ماتمِ ہم داشتن

—(۲۶۷)—

چہ غم؟ ار بہ جِد گرفتی، ز من احتراز کردن
نتواں گرفت از من، بگزشتہ ناز کردن

نگہت بموشگافی، ز فریبِ رم نخوردن
نفسم بدام بافی، ز سخن دراز کردن

زغمِ تو بادشرمم! کہ چہ مایہ شوخ چشمیست
ز شکستِ رنگ، بر رخ درِ خلد باز کردن؟

بفشارِ رشکِ بزمت، نہ چناں گداخت گلشن
کہ میانۂ گل و مل رسد امتیاز کردن

—(۲۶۸)—

چوں شمع، رود شب ہمہ شب ہمہ شب دود، زسرمان
زینگونہ، کرا روز بسر رفت، مگر مان؟
آذر بہ پرستیم و رخ از شعلہ نتابیم
اے خواندہ بسوے خود ازیں راہگزر مان!
غالبؔ، چہ زیاں؟ نالہ اگر گرمروی کرد
سوزے بدل اندر نہ و داغے بجگر مان

—(۲۶۹)—

خجل، ز راستیِ خویش، میتواں کردن
ستم بجانِ کج اندیش میتواں کردن
اگر بقدرِ وفا میکنی جفا، حیفست!
بمرگِ من! کہ ازیں بیش میتواں کردن

—(۲۷۰)—

حیفست، قتلگہ ز گلستاں شناختن!
شاخ از خدنگ و غنچہ ز پیکاں شناختن

لختِ دلم بدامن و چاکِ غمم بجیب
اینک، سزاے جیب ز داماں شناختن!

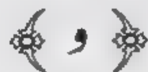
—(۲۷۱)—

بخونم دست و تیغ آلود جاناں
بدآموزاں، وکیلِ بے زباناں
چگویم در سپاسِ بےکسیہا؟
زہے! نامہربا ناں مہربا ناں
فغانا! میکساراں دجہ نوشاں
دریغا! ساقیاں اندازہ داناں
گلے بر گوشۂ دستار داری
خوشا! بختِ بلندِ باغباناں!!
گزشت از دل، ولے نگزشت از دل
خدنگِ غمزۂ زوریں کماناں

—(۲۷۲)—

تا ز دیوانم، کہ سرمستِ سخن خواہد شدن؟
ایں مے، از قحطِ خریداری، کہن خواہد شدن
کوکبم را، در عدم، اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم، بہ گیتی، بعدِ من خواہد شدن

سرشک افشانیِ چشمِ تَرَش بین
شہِ خوبان و گنجِ گوہرش بین
ادائے دلستانی رفتہ از یاد
ہوائے جانفشانی در سرش بین
بدشت آوردہ رو سیلست، گوئی
روا رَو در گدایانِ درش بین
صفائے تن فزوں تر کردہ رسوا
دل، از اندیشہ، لرزاں در برش بین
مہِ نو کردہ، کاہش، پیکرش را
بچشمِ کم، ہماں مہ پیکرش بین
خداوندش بخون ما مگیراد!
بہ بیتابی، نگہ بر خنجرش بین



حق کہ حقّست، سمیعست، فلانی! بشنو
بشنو، گر تو خداوندِ جہانی، بشنو
''لن ترانی'' بجوابِ ''اَرِنی'' چند و چرا؟
من نہ اینم، بشناس و تو نہ آنی، بشنو

سوے خود خوان و بخلوتگہِ خاصم جا دہ
آنچہ دانی، بشمار؛ آنچہ ندانی، بشنو

پردہٴ چند، بآہنگِ نکیسا، بسراے
غزلے چند، بہنجارِ فغانی، بشنو

زینکہ دیدی بجحیمم، طلبِ رحم خطاست
سخنے چند ز غمہاے نہانی بشنو

نامہ در نیمہٴ رہ بود کہ غالبؔ جاں داد
ورق از ہم در و ایں مژدہ زبانی بشنو

—(۲۷۵)—

نمِ اشکے، چو بخاکم بفشانی، از مہر
خاک بالد بخود و مہرگیا خیزد ازو
نجہد زیرِ سر انگشتِ تو نبضم؛ کہ مرا
نیست دردے کہ تمناے دوا خیزد ازو

—(۲۷۶)—

گوئی بمن؛ ''کسے کہ ز دشمن رسیدہ، کو؟''
آں پیر زالِ سست پے، قد خمیدہ، کو؟

یادت نکردہ خصم، بعنواں، بلفظِ دوست
آں نامۂ نخواندہ، ز صد جا دریدہ، کو؟
گوئی: ''بشحنہ گوے کہ کس را نکشتہ ایم''
آں نعشِ نیم سوختہ، ز آتش کشیدہ، کو؟
گوئی: ''خمش شوی، چو ز کویم بدر روی''
آں دل کہ جز بنالہ نپیچ آرمیدہ، کو؟
گوئی: ''دمے ز گریۂ خونیں بما برآر''
آں مایہ خوں کہ سر دہم از دل بدیدہ، کو؟

—(۲۷۷)—

بالم بخویش بسکہ، بہ بندِ کمندِ تو
مَردم گماں کنند کہ تنگم بہ بندِ تو

در رہگزر، بہ پرسشِ ما گر کشی، چہ باک؟
آخر، شراب نیست عنانِ سمندِ تو

—(۲۷۸)—

گستاخ گشتہ ایم، غرورِ جمالِ کو؟
پیچیدہ ایم سر ز وفا، گوشمال کو؟

تا کے فریبِ حلم؟ خدا را! خدا نہ
آں خوے خشمگین و ادائے ملال کو؟

داغم ز رشکِ شوکتِ صنعاں؛ ولے چہ سود؟
آں دستگاہِ طاعتِ ہفتاد سال کو؟

در بادۂ طہور، غمِ محتسب کجا؟
در عیشِ خلد، لذتِ بیمِ زوال کو؟

—(۲۷۹)—

دولت بغلط نبود، از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو
از ہرزہ رواں گشتن، قلزم نتواں گشتن
جوئی، بخیاباں رو؛ سیلی، بہ بیاباں شو
آوازۂ معنی را بر سازِ دبستاں زن
ہنگامۂ صورت را بازیچۂ طفلاں شو
گر چرخِ فلک گردی، سر بر خطِ فرماں نہ
ور گوے زمیں باشی، وقفِ خمِ چوگاں شو
در بندِ شکیبائی، مردم ز جگر خائی
ای حوصلہ! تنگی کن، اے غصہ! فراواں شو
سرمایہ کرامت کن، وانگاہ بغارت بر

بر خرمنِ ما برقے، بر مزرعہ باراں شو
جاں داد بغم غالبؔ؛ خوشنودیِ روحش را
در بزمِ عزا مے کش، در نوحہ غزلخواں شو



میرود، خندہ بسامانِ بہاراں زدہ
خونِ گل ریختہ و مے بگلستاں زدہ
شورِ سودائے تو نازم! کہ بگل می بخشد
چاکے از پردۂ دل، سر بگریباں زدہ
خوشنوا بلبلِ پروانہ نژادے دارم
شعلہ در خویش، ز گلبانگِ پریشاں، زدہ
خاک در چشمِ ہوس ریز؛ چہ جوئی از دہر:
بارگاہے بفرازِ سرِ کیواں زدہ

—(۲۸۱)—

بتے دارم، از اہلِ دل رم گرفتہ
بشوخی، دل از خویشتن ہم گرفتہ
ز سفاک گفتن، چو گل، برشگفتہ
دریں شیوہ، خود را مسلّم گرفتہ
بہ بیداد، صد کشتہ برہم نہادہ

بازیچہ، صد گونہ ماتم گرفتہ
برویش، ز گرمی، نگہ تاب خوردہ
بکویش، برفتن، صبا دم گرفتہ

—(۲۸۲)—

گاہے بچشم دشمن و گاہے در آئنہ
پرکارِ عیب جوئےِ خویشم، ہر آئنہ
حیرت، نصیبِ دیدہ ز بیتابیِ دلست
سیماب را حقیست، ہمانا، بر آئنہ
دورت ربودہ ناز؛ بخود ہم نمی رسی
تا چند در ہوائے تو ریزد پر، آئنہ

—(۲۸۳)—

شاہا! بہ بزمِ جشن، چو شاہاں، شراب خواہ
زر بیحساب بخش و قدح بیحساب خواہ
بزمت بہشت و بادہ حلالست در بہشت
گر باز پرس رو دہد، از من جواب خواہ
ہرچند، خواستن نہ سزاوارِ شانِ تست
قوت ز طالع و نظر از آفتاب خواہ

—(۲۸۴)—

دارم دلے، ز غصه گرانبار بودهٔ
بر خویشتن، ز آبله، چیزے فزودهٔ
از بهرِ خویش تنگم و دارم ز بخت، چشم
خود را در آب و آئنه رخ نانمودهٔ
گمنام و زهد کیشم و خواهم بمن رسد
در رختِ خوابِ شاه، بمستی غنودهٔ
خجلت نگر که در حَسَناتم نیافتند
جز روزهٔ درستِ بصهبا کشودهٔ

—(۲۸۵)—

چوں زبانها لال و جانها پر ز غوغا کردهٔ
بایدت از خویش پرسید، آنچه با ما کردهٔ
دجله می جوشد؛ همانا، دیده ها جویاے تست!
شعله می بالد؛ مگر در سینه ها جا کردهٔ!

—(۲۸۶)—

دانستهٔ که عاشقِ زارم، گدا نیَم
دانم که شاهدی، شهِ گیتی ستاں نه

نازم تلوّنِ تو، بہ بختِ خود و رقیب!
با او چنیں نبودی و با ما چناں ہنے

—(۲۸۷)—

مر، ز فنا، فراغ را مژدۂ برگ و ساز دہ
سایہ بہ مہر وا گزار، قطرہ بہ بحر باز دہ
طرۂ حبیب را، ز چاک، شانۂ التفات کش
عارضِ خویش را، ز اشک، غازۂ امتیاز دہ
از نمِ دیدہ، دیدہ را رونقِ جویبار بخش
وز تفِ نالہ، نالہ را چاشنیِ گداز دہ
گر بغمے کہ خوردہ ام، رخصتِ اشک و آہ نیست
ہم بہ دلے کہ بردۂ، طاقتِ ضبطِ راز دہ

—(۲۸۸)—

بر دست و پاے، بندِ گرانے نہادۂ
نازم بہ بندگی! کہ نشانے نہادۂ
تا در امید، عمر بہ پندار بگورد
از لطف، در حیات، نشانے نہادۂ
تا خستۂ بلا نبود بے گریزگاہ
در مرگ، احتمالِ امانے نہادۂ
بر ہر دلے، فسونِ نشاطے دمیدۂ

بر ہر نتنے، سپاسِ روانے نہادۂ
غالبؔ ز غصہ مرد؛ ہمانا، خبر نداشت
کاندر خرابہ، گنجِ نہانے نہادۂ

﴿ ی ﴾

بگوشم می رسد، از دور، آوازِ درا امشب
دلے گم گشتۂ دارم کہ در صحراست، پنداری
گرستیم آنقدر کز خوں، بیاباں لالہ زارے شد
خزانِ ما، بہارِ دامنِ صحراست، پنداری
نویدِ وعدۂ قتلے بگوشم می رسد، غالبؔ
لبِ لعلش بکامِ بیدلاں گویاست، پنداری

—(۲۹۰)—

گر نہ نواہا سرودے، چہ غمستے؟
من کہ نیم، گر نبود مے چہ غمستے؟
بختِ خود ار بودمے، کہ تا بقیامت
بیخبر از خود غنودمے، چہ غمستے

حیف! ز عیسیٰ کہ دور رفت، وگرنہ
معجزۂ دم نمودے، چہ غمستے؟
آہ! ز داؤد کاں نماند، وگرنہ
نالہ بہ لحن آزمودے، چہ غمستے؟

—(۲۹۱)—

در بستنِ تمثالِ تو ، حیرت رقمستے
بینش، کہ بہ پرکار کشائی علمستے
غم را بہ تنومندی، سہراب گرفتم؛
خود موجِ مے، از دشنۂ رستم چہ کمستے؟
گفتن ز میاں رفتہ و دائم کہ ندانی
با من کہ بمرگم، ز تو پرسش ستمستے

—(۲۹۲)—

اے بہ صدمۂ آہے، بر دلت ز ما بارے!
اینقدر گراں نبود نالۂ ز بیمارے
اے فنا! درے بکشا؛ بو کہ در تو بگریزد
ہم زخلق نومیدے، ہم زخویش بیزارے!

—(۲۹۳)—

بدیں خوبی، خرد گوید کہ ''کامِ دل مخواہ از وے''
نکو روے و نکو کار و نکو نامست، آہ! از وے

نگارم سادہ و من رندِ رنگ آمیزِ رسوایم
چہ نقشِ مدعا بندم، بدیں روے سیاہ، از وے؟

جنونِ رشک را نازم! کہ چوں قاصد رواں گردد
دَوَم بیخویش و گیرم نامہ، اندر نیمہ راہ، از وے

ز ہم دوریم با ایں مایہ نسبت؛ نامرادی بیں!
شبِ تاریک از ما باشد و روے چو ماہ از وے

نگاہش سُرمگیں باشد، چو مژگان سرکشست؛ آرے!
فروماند سپہ دارے کہ برگردد سپاہ از وے

بہ غالبؔ آشتی کردیم؛ دیگر داوری نبود
گزافِ دایی از ما، شرابِ گاہ گاہ از وے

—(۲۹۴)—

نخواہم از صفِ حوراں، ز صد ہزار، یکے
مرا بسست، ز خوبانِ روزگار، یکے

سراغِ وحدتِ ذاتش تواں، ز کثرت، جُست؛
کہ سایرست در اعدادِ بے شمار، یکے

مرو ز آئنہ خانہ کہ خوش تماشائیست:
یکے تو محوِ خودی و چو تو ہزار یکے

—(۲۹۵)—

اندوہِ پُرافشانی، از چہرہ عیانستے
خوں ناشدہ رنگ، اکنوں، از دیدہ روانستے
ذوقِ دلِ خود کامش، دریاب ز فرجامش
ہر حلقۂ گلدامش، چشمے نگرانستے
رازِ تو، شہیداں را در سینہ، نمی گنجد
ہر سبزہ، دریں مشہد، مانا بزبانستے
ساقی! بزر افشانی، دانم ز کریمانی
پیمانہ گراں تر دہ، گر بادہ گرانستے
فیضِ ازلی نبود مخصوص گروہے را
حرفیست کہ "مے خوردن آئینِ مغانستے"

—(۲۹۶)—

تابم ز دل برد کافر ادائے
بالا بلندے، کوتہ قبائے
در دیر گیری، غافل نوازے
در زود میری، عاشق ستائے

در کام بخشی، ممسک امیرے
در دلستانی، مُبرِم گدائے

گستاخ سازے، پوزش پسندے
طاقت گدازے، صبر آزمائے

در عرضِ دعویٰ، لیلیٰ نکوہے
بر رغمِ غالبؔ، مجنوں ستائے

—(۲۹۷)—

بدل، ز عربدہ، جائے کہ داشتی، داری
شمارِ عہدِ وفائے کہ داشتی، داری

تو کے ز جور پشیماں شدی؟ چہ میگوئی؟
دروغِ راست نمائے کہ داشتی، داری

عتاب و مہرِ تو از ہم شناختن نتواں
خرد فریب ادائے کہ داشتی، داری

بکردگار نگرویدی و ہماں بفسوس
حدیثِ روزِ جزائے کہ داشتی، داری

—(۲۹۸)—

اگر بشرع، سخن درمیاں بگردانی
ز سوے کعبہ، رخِ کارواں بگردانی
بہ نیم ناز، کہ طرحِ جہانِ نو فگنی
زمیں بگستری و آسماں بگردانی
بہ بیمِ خوے خودم، در عدم بخوابانی
بذوقِ روے خودم، در جہاں بگردانی
بہ بذلہ، خاطرِ اسلامیاں بیازاری
بجلوہ، قبلۂ زردشتیاں بگردانی

—(۲۹۹)—

اے موجِ گل! نویدِ تماشاے کیستی؟
انگارۂ مثالِ سراپاے کیستی؟
خوں گشتم از تو؛ باغ و بہارِ کہ بودۂ؟
کشتی مرا بغمزہ، مسیحاے کیستی؟
از خاکِ غرقۂ کفِ خونے دمیدۂ؟
اے داغِ لالہ! نقشِ سویداے کیستی؟
با ہیچ کافر، ایں ہمہ سختی نمی رود
اے شب! بمرگِ من! کہ تو فرداے کیستی؟

—(۳۰۰)—

از کنارِ دجلہ، آتش خانہ چنداں دور نیست
کشتیِ ما بر شکستن زد، دَرستاں یارۓ!

شاد باش! اے غم، ز بیمِ مرگم ایمن ساختے
گشت صرفِ زندگانی، بود گر دشوارۓ

با خرد گفتم: ''چہ باشد مرگ بعد از زندگی؟''
گفت: ''ہے! خوابِ گرانے از پسِ بیدارۓ''

—(۳۰۱)—

رفت آنکہ کسبِ بوے تو از باد کردمے!
گل دیدمے و روے ترا یاد کردمے!

رفت آنکہ گر براہِ تو جاں دادمے، ز ذوق
از موجِ گردِ رہ، نفس ایجاد کردمے!

اکنوں، خود از وفاے تو، آزار می کشم
رفت آنکہ از جفاے تو فریاد کردمے!

غالبؔ، ہواے کعبہ بسر جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزمِ خلخ و نوشاد کردمے!

—(۳۰۲)—

بسکہ ہموارہ دلآویزی و شیریں حرکات
سایۂ طوبیٰ و جوے عسلی را مانی
بہ توانائیِ کوشش، نتواں یافت ترا
سرخوشیہاے قبولِ ازلی را مانی
بدلِ ہر کہ بچشمِ تو درآید ناگاہ
داری آنمایہ تصرف کہ ولی را مانی
اے کہ در طالعِ ما نقشِ تو ہرگز ننشست!
زہرۂ حوتی و شمسِ حملی را مانی

—(۳۰۳)—

اے کہ گفتم: ''ندہی دادِ دل'' آرے، ندہی
تا چو من، دل بہ مغاں شیوہ نگارے ندہی

ماہ و خرشید دریں دائرہ بیکار نیند
تو کہ باشی، کہ بخود زحمتِ کارے ندہی؟

پاے را، خضرِ قدم سنجیِ کوۓ نشوی
دوش را، قدرِ گراں سنگیِ بارے ندہی

سر، براہِ دمِ شمشیرِ جوانے نہ نہی
تن، بہ بندِ خمِ فتراکِ سوارے ندہی

سینہ را، خستۂ اندازِ فغانے نہ کنی
دیدہ را، مالشِ بیدادِ غبارے ندہی
حیف! گر تن بہ سگانِ سرِ کوئے نرسد
وائے! گر جاں بہ سرِ راہگزارے ندہی

—(۳۰۴)—

ہمنشیں، جانِ من و جانِ تو ایں انگیز، ہے!
سینۂ از ذوقِ آزارِ منش لبریز، ہے!
برسرِ کوے تو بیخود گشتنم، از ضعف نیست
کشتۂ رشکم، نیارم دید خود را نیز، ہے!
تیشہ را نازم! کہ بر فرہاد آساں کرد مرگ
خنجرِ شیرویہ و جاں دادنِ پرویز، ہے!

—(۳۰۵)—

خوشنود شوی، چوں دلِ خوشنود نیابی
ترسم کہ زیاں کار کسی، سود نیابی
از قافلۂ گرم روانِ تو نباشد
رختے کہ، بہ سیلش، شرر اندود نیابی
بر ذوقِ خداداد، نظر دوختگانیم
در سینۂ ما، زخم نمک سود نیابی

در وجد، بہنجارِ نفس دست فشانیم
در حلقۂ ما، رقصِ دف و عود نیابی

—(۳۰۶)—

سرچشمۂ خونست، ز دل تا بزباں، ہاے!
دارم سخنے با تو و گفتن نتواں، ہاے!
سیرم نتواں کرد، ز دیدارِ نکویاں
نظّارہ بود شبنم و دل ریگِ رواں، ہاے!
ذوقیست دریں مویہ کہ بر نعشِ منتش
ہا! دلشدۂ، ہیچ مگوے، ہمہ داں، ہاے!
از جنت و سرچشمۂ کوثر چہ کشاید؟
خونِ گشتہ دل و دیدۂ خونابہ فشاں، ہاے!
غالبؔ، بدل آویز؛ کہ در کارگہِ شوق
نقشیست دریں پردہ، بصد پردہ نہاں، ہاے!

—(۳۰۷)—

زاہد کہ و مسجد چہ و محراب کجائی؟
عیدست و دمِ صبح؛ مےِ ناب! کجائی؟
بوے گل و شبنم نسزد کلبۂ ما را
صرصر! تو کجا رفتی و سیلاب! کجائی؟

—(۳۰۸)—

دل، کہ از من مر ترا، فرجام، ننگ آرد ہے
برسرِ راہِ تو با خویشم بجنگ آرد ہے
پنجہٗ نازک ادایش را نگارے دیگرست
خوں کند دل را نخست، آنگہ بچنگ آرد ہے
بوسہ گر خواہی بدیں شنگی، بہ پیچد تنگ تنگ
عذر اگر باید بمستی، رنگ رنگ آرد ہے
ہمچناں در بندِ سامانِ مرادش سنجے
گر، بجاے شیشہ، بخت از دوست سنگ آرد ہے

—(۳۰۹)—

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بشمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد، رقصِ بتانِ آزری
فیضِ نتیجہٗ ورع، از مے و نغمہ یافتیم
زہرہٗ ما، بریں اُفق، دادہ فروغِ مشتری
اے تو کہ ہیچ ذرّہ را، جز برہِ تو، روے نیست!
در طلبت، تواں گرفت بادیہ را برہبری
ہر کہ دلست در برش، داغِ تو رویدش ز دل
تا چو بدیگرے دہد، باز بری بداوری
رشکِ ملک چہ و چرا، چوں بتو رہ نمی برد؟
بیہدہ، در ہواے تو می پرد، از سبک سری

حیف! کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری، نالہ بسینہ بنگری

—(۳۱۰)—

امیدگاہِ من و ہمچو من ہزار، یکیست
ز رشک، در صددِ ترکِ مدعاستمے
سخن ز دشمن و غمہاے ناگوارش نیست
ز دوست، داغِ ستمہاے ناروا ستمے
دیت مگوے و ملامت مسنج و فتنہ مگیر
چہ شد، کہ ہیچ کسم، بندۂ خداستمے

—(۳۱۱)—

بہارم دیدن و رازم شنیدن بر نمی تابد
نگہ تا دیدہ خونستے، و دل تا زہرہ آبستے!
ہجومِ جلوۂ گل، کاروانم را غبارستے
طلوعِ نشاۂ مے، مشرقم را آفتابستے
فغانم را، نواے صورِ محشر ہمعنانستے
بیانم را، رواجِ شورِ طوفاں در رکابستے
دلم، صبحِ شبِ وصلِ تو، بر کاشانہ می لرزد
در و بامم بوجد، از ذوقِ بوے رختِ خوابستے

رُباعیات

(فارسی)

اے دادہ بباد عمر، در لہو و فسوں!
زنہار! مشو ز رحمتِ حق مایوس
ہشدار! کز آتشِ جہنم حق را
تہذیب غرض بود، نہ تعذیبِ نفوس

—(۲)—

غالب، بگہر، ز دودۂ زادشم
زاں رو، بہ صفائے، دمِ تیغست دمم
چون رفتِ سپہبدی، زدم چنگ بہ شعر
شد تیرِ شکستۂ نیاگان قلمم

—(۳)—

ہرچند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ
در عہدۂ رحمتِ خدائیم ہمہ
در جلوہ دہد، چنانکہ مائیم ہمہ
شایستۂ نفت و بوریائیم ہمہ

—(۴)—

آں مرد کہ زن گرفت، دانا نبود
از غصہ فراغتش، ہمانا، نبود
دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو
نازم بخدا! چرا توانا نبود؟

—(۵)—

آن خستہ کہ در نظر بجز یارش نیست
با سود و زیانِ خویشتن، کارش نیست
طالب، ز طلب، رہینِ آثارش نیست
ہرچند حنا برگ دہد، بارش نیست

—(٦)—

در سینہ، ز غم، زخمِ سنانی دارم
چشم و دلِ خونابہ فشانی دارم
دانی کہ مرا چوں تو نمی باید ہیچ؟
اے فارغ ازاں کہ جسم و جانی دارم!

—(۷)—

اے آنکہ ترا سعی بدرمانِ منست!
مُنعَم مکن از بادہ؛ کہ نقصانِ منست
حیفست! کہ بعدِ من بمیراث رود
ایں یک دو سہ خم کہ در شبستانِ منست

—(۸)—

او راست، اگر ہزار چیزم بخشند
او راست، اگر بہشت نیزم بخشند
بر دوست فدا کنم، بصد گونہ نشاط
جانے کہ بروزِ رستخیزم بخشند

—(۹)—

آنم کہ بہ پیمانۂ من، ساقیِ دہر
ریزد ہمہ دُردِ دَرد و تلخابۂ زہر
بگذر ز سعادت و نحوست؛ کہ مرا
ناہید بغمزہ کشت، و مریخ بہ قہر

—(۱۰)—

یارب! بجہانیاں دلِ خرم دہ
در دعویِ جنّت، آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت، باغش از تست
آں مسکنِ آدم بہ بنی آدم دہ

—(۱۱)—

ہر کس، ز حقیقت خبرے داشتہ است
بر خاکِ رہِ عجز، سرے داشتہ است
زاہد، ز خدا، ارم بدعوی طلبد
شداد، ہمانا، پسرے داشتہ است

—(۱۲)—

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش!
آنروز کہ وقتِ بازپرس آید پیش
بگزار مرا، کہ من خیالے دارم
با حسرتِ عیشہاے ناکردۂ خویش

—(۱۳)—

در عالمِ بے زوری، کہ تلخست حیات
طاعت نتواں کرد، بامیدِ نجات
اے کاش! زحق اشارتِ صوم وصلوات
بودے بوجودِ مال، چوں حج و زکوات

—(۱۴)—

دستم بکلیدِ مخزنے می بایست
ور بود تہی، بدامنے می بایست
یا ہیچگہم بہ کس نیفتادے کار
یا خود بزمانہ، چوں منے می بایست

—(۱۵)—

ہستم ز مےِ امید سرمست و بست
دارم سرِ ایں کلاوہ در دست و بست
گر ارزشِ لطف و کرمی نیست، مباش
استحقاقِ ترحمی ہست و بست

—(۱۶)—

بر قولِ تو، اعتماد نتواں کردن
خودِ را، بگزاف، شاد نتواں کردن
از کثرتِ وعدہ ہائے پے در پےِ تو
یک وعدہ درست یاد نتواں کرد

—(۱۷)—

اے کردہ بہ آرایشِ گفتار بسیچ!
در زلفِ سخن، کشودہ راہِ خم و پیچ!
عالم، کہ تو چیزِ دیگرش میدانی،
ذاتیست بسیطِ مُنبسِط، دیگر ہیچ

—(۱۸)—

دارم دلِ شاد و دیدۂ بینائے
وز کرّی، گوشم، نبود پروائے
خوبست کہ نشنوم ز ہر خود رائے
گلبانگِ ''اَنا ربُکم الاعلائے''

ooo

انتخابِ غالب

اُردو

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

غزلیات

﴿ الف ﴾

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے!
سینۂ شمشیر سے باہر ہے، دم شمشیر کا
بسکہ ہوں، غالبؔ، اسیری میں بھی آتشِ زیرِ پا
موے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

—(۲)—

کہتے ہو: ''نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا''
دل کہاں کہ گم کیجیے؟ ہم نے مدعا پایا
عشق سے، طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے؛ اعتمادِ دل معلوم!
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

—(۳)—

میں عدم سے بھی پرے ہوں؛ ورنہ، غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

—(۴)—

بوے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا، بقدرِ لب و دنداں، نکلا
تھی نوآموزِ فنا، ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا!
دل میں، پھر گریے نے اک شور اُٹھایا، غالبؔ
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

—(۵)—

دہر میں، نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے، ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی، حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر، مرے مرنے پہ بھی، راضی نہ ہوا

—(۶)—

ستائش گر ہے، زاہد اس قدر، جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے، ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے، بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا!
کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی، مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ؛ ویرانی تماشا کر!
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے، میرے درباں کا

ہنوز، اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے!
دلِ افسردہ، گویا، حجرہ ہے، یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں؛ ورنہ
سبب کیا، خواب میں آ کر، تبسم ہائے پنہاں کا؟

—(۷)—

محبّت تھی چمن سے؛ لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا!

—(۸)—

محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا!
رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظّارہ ہے
یہ وقت ہے، شگفتنِ گلہاے ناز کا!
تو اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز!
میں اور دُکھ تری مژہ ہاے دراز کا!
ہیں، بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا

—(۹)—

شب ہوئی، پھر انجم رخشندہ کا منظر کُھلا
اس تکلف سے کہ، گویا، بتکدے کا دَر کُھلا
گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کُھلا
گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کُھلا!
ہے، خیالِ حسن میں، حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک دَر ہے، میری گور کے اندر، کُھلا

منہ نہ کھلنے پر، ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں!
زلف سے بڑھ کر، نقاب اُس شوخ کے منہ پر، کُھلا

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے، نامہ بر اکثر کُھلا

اُس کی امّت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟
واسطے جس شہ کے، غالبؔ، گنبدِ بے دَر کُھلا

—(۱۰)—

شب کہ برقِ سوزِ دل سے، زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ، ہر یک حلقۂ گرداب، تھا!

نالۂ دل میں شب، اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے، دل کیا نشاط آہنگ ہے!
خانۂ عاشق، مگر، سازِ صدائے آب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک، تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں، اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا

—(۱۱)—

ایک ایک قطرہ کا مجھے، دینا پڑا، حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو؛ کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اَب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا

—(۱۲)—

بسکہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میّسر نہیں، انساں ہونا!
گریہ، چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے، بیاباں ہونا
کی، مرے قتل کے بعد، اُس نے جفا سے توبہ
ہائے! اُس زدو پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف! اُس چارگرہ کپڑے کی قسمت، غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو، عاشق کا گریباں ہونا

—(۱۳)—

نالۂ دل نے دیے، اوراقِ لختِ دل، بباد
یادگارِ نالہ، اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

—(۱۴)—

دوست، غمخواری میں میری، سعی فرماویں گے کیا؟
زخم کے بھرتے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری؛ بندہ پرور! کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے: ''کیا؟''
حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ!
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟

—(۱۵)—

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا!
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے، جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو!
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا؟
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں؟ کہ دل ہے:
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا؟

اسے کون دیکھ سکتا؟ کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان، غالبؔ!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ تو بادہ خوار ہوتا

—(۱۶)—

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا، کیا!
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدّعا کیا؟
کہاں تک، اے سراپا ناز! ''کیا، کیا؟''
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہاے تمکیں آزما کیا؟
نفس، موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہاے ساقی کا گلا کیا؟
دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ ''أنا البحر''
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟
محابا کیا ہے؟ میں ضامن، ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟
سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا! سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

—(۱۷)—

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا؟
بندگی میں بھی، وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سینے کا داغ ہے، وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہے، جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُنِ مو سے، دمِ ذکر، نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصّہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا!
تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا

—(۱۸)—

زکوٰۃِ حسن دے، اے جلوۂ بینش! کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا
وہی اک بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

—(۱۹)—

زُہرہ گر ایسا ہی، شامِ ہجر میں، ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب، سیلِ خانماں ہوجائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا؟
یعنی، یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری؛ جو تو راضی ہوا
مجھ پہ، گویا، اک زمانہ مہرباں ہوجائے گا
وائے! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہوجائے گا

—(۲۰)—

درد، منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی، گھر میں بوریا نہ ہوا!
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں، مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے، کہ دلستانی ہے!
لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا

—(۲۱)—

دل اُس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے، دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں، حسن کے تقاضا کا؟
فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اُس کو یاد، اسد
جفا میں اس کی، ہے انداز کارفرما کا

—(۲۲)—

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا!
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

—(۲۳)—

میں، اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟
ہے ایک تیر، جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا!
درماندگی میں، غالب کچھ بن پڑے، تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

—(۲۴)—

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا
بحر، گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلا کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

—(۲۵)—

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا!
ہوا جب غم سے یوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدّت کہ غالبؔ مرگیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر یک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا، تو کیا ہوتا؟"

—(۲۶)—

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

—(۲۷)—

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل، تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا، اس قدر آساں سمجھا!

—(۲۸)—

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا!
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی!
کیوں ترا راہگزر یاد آیا؟
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی،
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا!
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا!
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے، گھر یاد آیا

—(۲۹)—

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلا
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں؟
کبھی فتراک میں تیرے، کوئی نخچیر بھی تھا؟
یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے؟ خیر ہوئی!
گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں؛ رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں، وہ جواں میر بھی، تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی
آخر، اُس شوخ کے ترکش میں، کوئی تیر بھی تھا؟
پکڑے جاتے ہیں؛ فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

—(۳۰)—

تو دوست کسی کا بھی، ستمگر، نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا، مہِ نخشب کی طرح، دستِ قضا نے
خورشید، ہنوز، اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے، ازل سے
آنکھوں میں ہے، وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
دریاے معاصی، تنک آبی سے، ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی، ابھی، تر نہ ہوا تھا

—(۳۱)—

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں؟
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منتِ کیموس تھا

—(۳۲)—

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے، رہ گئے
صاحب کو، دل نہ دینے پہ، کتنا غرور تھا!
قاصد کو، اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے؛ یہ میرا قصور تھا

—(۳۳)—

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
مرنے کی، اے دل! اور ہی تدبیر کر؛ کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا!
وا کردیے ہیں، شوق نے، بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا

—(۳۴)—

رشک کہتا ہے کہ ''اُس کا غیر سے اخلاص، حیف!''
عقل کہتی ہے کہ ''وہ بے مہر کس کا آشنا؟''

میں، اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا!

—(۳۵)—

ذکر اُس پَری وَش کا، اور پھر بیاں اپنا!
بن گیا رقیب، آخر، تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں؟ یارب!
آج ہی ہوا منظور، اُن کو امتحاں اپنا
منظر اک، بلندی پر، اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا، کاش کے! مکاں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں، اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟
بے سبب ہوا، غالبؔ، دشمن آسماں اپنا!

—(۳۶)—

سرمۂ مفتِ نظر ہوں: مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

—(۳۷)—

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے!
شرمندگی سے، عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں: کہ ہے
پُر گل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا!

—(۳۸)—

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں: ''ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟''
رات دن، گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟
عمر بھر، دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا؟
پوچھتے ہیں وہ کہ ''غالبؔ کون ہے؟''
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہوجانا
درد کا حد سے گزرنا، ہے دوا ہوجانا

تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا، بات کے بنتے ہی، جدا ہوجانا!

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ!
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہوجانا!!

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا

﴿ ب ﴾

جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی، ہے بالِ ہما، موجِ شراب

افسوس! کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی، تھی درخورِ عقدِ گہر، انگشت

—(۴۲)—

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے، حضرت سلامت!
جگر کو مرے، عشقِ خونابہ مشرب
لکھے ہے، ''خداوندِ نعمت، سلامت!''
علی الرّغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک، مبارک! سلامت، سلامت!

—(۴۳)—

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت!

—(۴۴)—

عشق میں، بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں، آخر؛ گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن! کہ اُس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

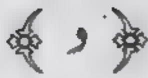
یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ، زبس تکرارِ دوست

﴿ ج ﴾

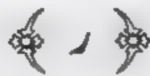
اے عافیت! کنارہ کر؛ اے انتظام! چل
سیلابِ گریہ، درپےِ دیوار و دَر ہے، آج

—(۴۶)—

لو، ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج؟



حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا، میرے بعد
بارے، آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد
شمع بجھتی ہے، تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد
خوں ہے دل، خاک میں، احوالِ بتاں پر: یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد
''کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مرد افگنِ عشق؟''
ہے مکرّر لبِ ساقی میں صلا، میرے بعد
غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد



بلا سے، ہیں جو یہ پیشِ نظر، دَر و دیوار!
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پَر، دَر و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہوگئے مرے دیوار و دَر، دَر و دیوار

نہیں ہے سایہ؛ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر، دَر و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پانْو پر دَر و دیوار؟
وہ آرہا مرے ہمسائے میں، تو سائے سے
ہوئے فدا دَر و دیوار پر، دَر و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے، بن تیرے، گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم، دیکھ کر دَر و دیوار

—(۴۹)—

گھر جب بنالیا ترے دَر پر، کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر؟
کام اُس سے آپڑا ہے، کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق، گو، مجھے کافر کہے بغیر!
مقصد ہے ناز و غمزہ؛ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے، دَشنہ و خنجر کہے بغیر
ہرچند، ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات، مکرّر کہے بغیر

—(۵۰)—

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر؟
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
کیا آبروے عشق؟ جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں، تم کو "بے سبب آزار" دیکھ کر
ثابت ہوا ہے، گردنِ مینا پہ، خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے، تری رفتار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ، متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
زنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو، چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ، غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر!

—(۵۱)—

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے، تشویشِ مرہم سے!
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل، نمک داں پر

مجھے، اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر

نہ لڑ ناصح سے، غالبؔ؛ کیا ہوا گر اُس نے شدت کی؟
ہمارا بھی تو، آخر، زور چلتا ہے گریباں پر!

—(۵۲)—

ہے بسکہ، ہر اک اُن کے اشارے میں، نشاں اور
کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور!

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے، بازار سے جاکر، دل و جاں اور

ہے خونِ جگر جوش میں؛ دل کھول کے روتا،
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور!

مرتا ہوں اس آواز پہ! ہرچند سر اُڑ جائے
جلاّد کو، لیکن، وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور!"

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

—(۵۳)—

نہ کی، سامانِ عیش و جاہ نے، تدبیر وحشت کی
ہوا، جامِ زمرّد بھی مجھے داغِ پلنگ، آخر

—(۵۴)—

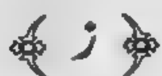
جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی؟
گریباں چاک کا حق ہوگیا ہے، میری گردن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے، تہمت نگہ کی، چشمِ روزن پر!

—(۵۵)—

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں، در پہ ترے ناصیہ فرسا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: ''قیامت کو ملیں گے''
کیا خوب! قیامت کا ہے، گویا، کوئی دن اور
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ، کیوں جیتے ہیں غالبؔ
قسمت میں ہے، مرنے کی تمنّا، کوئی دن اور



کیوں کر اُس بت سے رکھوں جان عزیز؟
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟
دل سے نکلا؛ پہ نہ نکلا دل سے
ہے، ترے تیر کا پیکان، عزیز
تاب لائے ہی بنے گی، غالبؔ
واقعہ سخت ہے، اور جان عزیز

—(۵۷)—

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکُل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز!

﴿ س ﴾

مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، ہے، ہے!!
خوب وقت آئے تم، اس عاشقِ بیمار کے پاس!

دیکھ کر تجھ کو، چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس

مرگیا، پھوڑ کے سر، غالبؔ وحشی، ہے، ہے!!
بیٹھنا اُس کا وہ، آکر تری دیوار کے پاس!

﴿ ک ﴾

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا، نمک؟
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک!

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ، واہ!
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

یاد ہیں، غالبؔ، تجھے وہ دن، کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چُنتا تھا نمک؟

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے؛ لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہوتے تک

﴿ ل ﴾

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے، بہار
میرا رقیب ہے، نفسِ عطر سائے گُل
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار، دوڑے ہے گل در قفائے گُل

﴿ م ﴾

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو، بیش از یک نفس
برق سے، کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ، ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں، اسدؔ!
جانتے ہیں، سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ، ہم

—(۶۴)—

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں؛ اے خدا
رکھ لیجو، میرے دعویٰ وارستگی کی شرم!

﴿ ن ﴾

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش؛ ولے
غالبؔ، یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں؟

—(۶۵)—

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج، ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے، کیا کہتے ہیں؟

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود
قبلے کو، اہلِ نظر ''قبلہ نما'' کہتے ہیں

دیکھیے، لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ؟
اُس کی ہر بات پہ ہم ''نامِ خدا'' کہتے ہیں

—(٦٦)—

آبرو کیا خاک اُس گل کی، کہ گلشن میں نہیں؟
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے، اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہوکر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہوگئے ہیں جمع، اجزاے نگاہِ آفتاب؛
ذرّے، اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا، ناتوانی کی نمود؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش میرے تن میں نہیں

—(۶۷)—

عہدے سے، مدحِ ناز کے، باہر نہ آسکا!
گر ایک ادا ہو، تو اُسے اپنی قضا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش!
تو اور ایک وہ نہ شنیدن، کہ کیا کہوں!

ظالم، مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ!
ہے، ہے! خدا نکردہ! تجھے بے وفا کہوں!

—(۶۸)—

مہرباں ہو کے بلالو مجھے، چاہو جس وقت
میں، گیا وقت نہیں ہوں، کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں، طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟
بات، کچھ سر تو نہیں ہے، کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستمگر؛ ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی، کہ کھا بھی نہ سکوں؟

—(۶۹)—

ہم سے کھل جاؤ، بہ وقتِ مے پرستی، ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر عذرِ مستی، ایک دن

—(۷۰)—

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے؛ وگرنہ مراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا؟
پرسش ہے، اور پاے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں
ہرچند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے؛
ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں، مطربِ ترانۂ ''ہَل مِن مزید'' ہے
لب، پردہ سنجِ زمزمۂ ''اَلاَماں'' نہیں

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دونیم
دل میں چھری چبھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں؛ بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے، بیاباں گراں نہیں

جاں ہے بہاے بوسہ؛ ولے کیوں کہے، ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

—(۷۱)—

مانعِ دشت نوردی، کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پانْو میں، زنجیر نہیں

سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذّتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

—(۷۲)—

مت، مردمکِ دیدہ میں، سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع، سویداے دلِ چشم میں، آہیں

—(۷۳)—

برشکالِ گریۂ عاشق ہے؛ دیکھا چاہیے
کِھل گئی، مانندِ گُل سو جا سے، دیوارِ چمن

—(۷۴)—

ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خُرشید نہیں
کہتے ہیں ''جیتے ہیں امید پہ لوگ''
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

—(۷۵)—

ترے سروِ قامت سے، اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

—(۷۶)—

ملتی ہے خوے یار سے، نار، التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں؟

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے!
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی، اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی ہوئی، طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا!
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں!

وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے، شگاف پڑے آفتاب میں!

وہ سحر، مدّعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے، سفینہ رواں ہو سراب میں!

—(۷۷)—

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں؟

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

—(۷۸)—

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

جانا پڑا رقیب کے دَر پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہگزر کو میں

ہے کیا، جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے!
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں؟

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ: ”یہ بے ننگ و نام ہے“
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ؛
پہچانتا نہیں ہوں، ابھی، راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیدادگر کو میں؟

—(۷۹)—

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدر ہے، جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا: لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمھیں"
کس رُعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"!

—(۸۰)—

نالہ جز حسنِ طلب، اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم، نکونامیِ فرہاد، نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم!
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش، گویا
دی ہے، جاے دہن اُس کو دمِ ایجاد، نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے، بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

—(۸۱)—

دونوں جہان دے کے، وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں!
تھک تھک کے، ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں؟

—(۸۲)—

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو!
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟

—(۸۳)—

علاوہ عید کے، ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام؟
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدہ کا ذکر اُن سے کیوں کرو، غالبؔ؟
یہ کیا کہ تم کہو، اور وہ کہیں کہ ''یاد نہیں؟''

—(۸۴)—

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم!
اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں!
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

—(۸۵)—

دائم پڑا ہوا ترے دَر پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر، گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں!

—(۸۶)—

سب کہاں، کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں!
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں؛
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
قید میں یعقوب نے لی، گو، نہ یوسف کی خبر؛
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں
جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو؛ کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں
ان پری زادوں سے، لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے، یہی حوریں اگر واں ہوگئیں
نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں، جس کے بازو پر، پریشاں ہوگئیں
بسکہ روکا میں نے، اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں، بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزاے ایماں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

—(۸۷)—

دیوانگی سے، دوش پہ زنّار بھی نہیں:
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے، ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں؟
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے؟ اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

—(۸۸)—

نہیں ہے زخم کوئی، بخیے کے درخور، مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہاے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے، ہر قطرہ خوں، تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی؟
شبِ مہ ہو، جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
ہزاروں دل دیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہوکر، سویدا ہوگیا ہر قطرہ خوں تن میں

—(۸۹)—

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں!
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں!
مگر غبار ہوئے پر، ہوا اُڑا لے جائے؛
وگرنہ تاب وتواں بال و پَر میں خاک نہیں!
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں

—(۹۰)—

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار؛ کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟
دشنۂ غمزہ جاںستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
حسن اور اُس پہ حسنِ ظن! رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع!
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟
غالبِؔ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے، ہائے کیوں؟

—(۹۱)—

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ "یوں؟"
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ "یوں"
رات کے وقت مَے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں، خدا کرے! پر نہ کرے خدا کہ یوں!
میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"
سن کے، ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ "یوں؟"

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے، ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

—(۹۳)—

کعبے میں جارہا، تو نہ دو طعنہ؛ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِّ صحبتِ اہلِ کُنشت کو؟
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو، کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں، رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
غالبؔ، کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

—(۹۴)—

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو؟
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو؟

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو؟
''پیدا ہوئی ہے'' کہتے ہیں، ''ہر درد کی دوا''
یوں ہو، تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو؟
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو؟
ٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی!
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو؟

—(۹۵)—

قفس میں ہوں؛ گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے، نواسنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوے دوست دشمن کو!
خدا شرمائے ہاتھوں کو؛ کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو!
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں!
نہیں دیکھا، شناور جوے خوں میں، تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانْو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب، کاں میں، جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے!
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے، ابھی سے، برق خرمن کو
نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا: دُعا دیتا ہوں رہزن کو

—(۹۶)—

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانْو!
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانْو!
مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانْو
ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے، اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانْو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں؟
دُکھتے ہیں، آج، اُس بتِ نازک بدن کے پانْو

—(۹۷)—

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار:
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو؟

—(۹۸)—

واں پہنچ کر، جو غش آتا پئے ہم ہے، ہم کو
صد رہ، آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے، ہم کو

جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے، ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو!
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے، ہم کو!

—(۹۹)—

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو؟

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خُرشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے، ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو!

جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید؟
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو!

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن، خدا کرے! وہ ترا جلوہ گاہ ہو

—(۱۰۰)—

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو؟
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو، کیوں کر ہو؟
تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیوں کر ہو؟
اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے، شہر میں ہوں ایک دو، تو کیوں کر ہو؟
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیوں کر ہو؟

—(۱۰۱)—

کسی کو دے کے دل، کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ، ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

کیا غمخوار نے رسوا؛ لگے آگ اس محبت کو!
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر، اے سنگ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ؛ دیکھو، جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالبؔ؟
تِرے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

ی

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے

سیکھے ہیں، مہ رُخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟
اک گونہ بے خودی، مجھے دن رات چاہیے

—(۱۰۳)—

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے، باندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ!
مرے دریاے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی
مےِ عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے؟
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں، وہ بھی

—(۱۰۴)—

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی، آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

—(۱۰۵)—

تا، ہم کو شکایت کی بھی، باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ، ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

—(۱۰۶)—

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا؟
وہ جو رکھتے تھے ہم، اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

—(۱۰۷)—

کھُلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب؟
قسم کھائی ہے، اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم! مگر تمہید جانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابناے زماں، غالبؔ؟
بدی کی اُس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

—(۱۰۸)—

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے!
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے، ذرّے میں جان ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو؛ ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ہے، بارے، اعتمادِ وفاداری اِس قدر!
غالبؔ، ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

—(۱۰۹)—

کس طرح کاٹے کوئی، شب ہائے تارِ برشکال؟
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری، ہائے، ہائے!!

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال!
ایک دل، تس پر یہ ناامّیدواری، ہائے، ہائے!!

—(۱۱۰)—

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ "مرنے کی آس ہے"

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے!

پی، جس قدر ملے، شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

—(۱۱۱)—

گر خامشی سے فائدہ اخفاے حال ہے
خوش ہوں؛ کہ میری بات سمجھنی محال ہے
ہے، ہے! خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے؟
ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

—(۱۱۲)—

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ، کھود کھود کے، پوچھو
حذر کرو مرے دل سے؛ کہ اس میں آگ دبی ہے

—(۱۱۳)—

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا
ظاہرا، کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
مجھ سے مت کہ: ''تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی''
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

—(۱۱۴)—

خزاں کیا؟ فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو:
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پَر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی؛ ورنہ، اے ہمدم!
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا، کس نے دیکھا ہے؟

—(۱۱۵)—

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ، گویا، گردشِ سیارہ کی آواز ہے

—(۱۱۶)—

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی، تری عادت ہی سہی

—(۱۱۷)—

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن، ہے خندۂ دنداں نما مجھے
مستانہ، طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کرتا ہے، بسکہ، باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں، مرے دل کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے!!

—(۱۱۸)—

اُس بزم میں، مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے؛ سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے!
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے؟"
ضد کی ہے اور بات؛ مگر خو بُری نہیں
بھولے سے، اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ، تمھیں کہو کہ "ملے گا جواب کیا؟"
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

—(۱۱۹)—

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو، برق آفتاب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پاے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
میں، نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا، اسدؔ، مسرّتِ پیغامِ یار سے؛
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے!

—(۱۲۰)—

دلِ ناداں! تجھے ہوا ہے کیا ہے؟
آخر، اِس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش! پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ، اے خدا! کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

—(۱۲۱)—

کہتے تو ہو تم سب کہ ''بتِ غالیہ مو آئے!''
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ ''وو آئے!''
ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں! جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے!
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاّد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آئے
ہاں! اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت؟
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا وہ نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار، تو کعبہ ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالبؔ!
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

—(۱۲۲)—

پھر، کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر، جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
پھر، اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر، وہی زندگی ہماری ہے
بے خودی بے سبب نہیں، غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!

—(۱۲۳)—

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذت زندگانی کی

—(۱۲۴)—

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے؛
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
نالے، عدم میں، چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

—(۱۲۵)—

دیکھنا قسمت، کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے!
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟
غیر کو، یارب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے!
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے!
دور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے! واہ، واہ!!
نغمہ ہوجاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے
اُس کی بزمِ آرائیاں سن کر، دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدعاے غیر، بیٹھا جائے ہے
ہوکے عاشق، وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھُلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اُس کے، مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

—(۱۲۶)—

اُگ رہا ہے دَر و دیوار سے سبزہ، غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

—(۱۲۷)—

سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا؛ کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

—(۱۲۸)—

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کرگئی

شق ہوگیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ!
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری، کوے یار میں
بارے اب، اے ہوا! ہوسِ بال و پَر گئی

نظارے نے بھی کام کیا، واں، نقاب کا
مستی سے، ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فرداودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

—(۱۲۹)—

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل
میرے پتے سے، خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟

ساقی گری کی شرم کرو آج؛ ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے، جس قدر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

—(۱۳۰)—

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں، ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
دے کے خط، مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے!
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے!
ہوچکیں، غالبؔ، بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

—(۱۳۱)—

کوئی اُمید بر نہیں آتی!
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے، آتی تھی، حالِ دل پہ ہنسی
اب، کسی بات پر نہیں آتی!
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد؛
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں؛
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟
ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی:
موت آتی ہے، پر نہیں آتی

—(۱۳۲)—

جو نہ، نقدِ داغِ دل کی، کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مِری کہانی؟
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب؛ ورنہ کہتا
کہ ''مرے عدو کو، یارب، ملے میری زندگانی''!

—(۱۳۳)—

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل!
زنہار! اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے!

ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے؛
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے:
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

—(۱۳۴)—

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے!
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے!
دیتے ہیں جنت، حیاتِ دہر کے بدلے:
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے، کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے!
قتل کا میرے، کیا ہے عہد تو، بارے
وائے! اگر عہد اُستوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے، غالبؔ؟
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

—(۱۳۵)—

ہجومِ غم سے، یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

—(۱۳۶)—

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

—(۱۳۷)—

جس بزم میں، تو نازؔ سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سایے کی طرح، ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو، اس قدِ دلکش سے، جو گلزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح، آئنہ گفتار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ نالاں!
جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

—(۱۳۸)—

حسنِ مہ گرچہ، بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خرشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ:
جی میں کہتے ہیں کہ ''مفت آئے تو مال اچھا ہے''

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا:
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے، جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے!

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو، غالبؔ، یہ خیال اچھا ہے

—(۱۳۹)—

نہ ہوئی گر مِرے مرنے سے تسلّی، نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

مے پرستاں! خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

—(۱۴۰)—

عجب نشاط سے، جلاد کے، چلے ہیں ہم، آگے
کہ اپنے سایے سے، سر، پانْو سے ہے دو قدم آگے!
قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ اُلفت
فقط خراب لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے
خدا کے واسطے! داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم، آگے!

شکوہ کے نام سے، بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے؟

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؛ کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے؟

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ؛
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

—(۱۴۲)—

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ ''تو کیا ہے؟''
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندخو کیا ہے؟

چپک رہا ہے، بدن پر لہو سے، پیراہن
ہمارے جیب کو، اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے!
وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشک بو، کیا ہے؟
پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دوچار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟

—(۱۴۳)—

میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں!
چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے
قہر ہو، یا بلا ہو: جو کچھ ہو
کاشکے! تم مرے لیے ہوتے!
میری قسمت میں، غم گر اتنا تھا
دل بھی، یارب کئی دیے ہوتے!

آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے!

—(۱۴۴)—

خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں، تمھارے نام کے
عشق نے، غالبؔ، نکما کردیا؛
ورنہ، ہم بھی آدمی تھے کام کے

—(۱۴۵)—

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک!
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی:
کہ زمیں ہوگئی ہے، سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روے آب پر کائی

—(۱۴۶)—

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

—(۱۴۷)—

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری!
کیا بیاں کر کے مرا، روئیں گے یار؟
مگر آشفتہ بیانی میری
متقابل ہے، مقابل میرا
رُک گیا، دیکھ روانی میری
دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھُل گئی ہیچمدانی میری

—(۱۴۸)—

از بسکہ، سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا، اِک چشم نمائی ہے

—(۱۴۹)—

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے، اِک بوند لہو کی!

—(۱۵۰)—

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے!
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟
بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے، بیگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے!
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

—(۱۵۱)—

ہر قدم، دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے، بیاباں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے!!
سایہ، خرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

—(۱۵۲)—

نکتہ چیں ہے؛ غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے؟
میں بلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے؛ کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے:
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے، لیے یوں ترے خط کو، کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو! وہ بھلے ہیں تو کیا؟
ہاتھ آویں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
پردہ چھوڑا ہے وہ، اُس نے، کہ اُٹھائے نہ بنے

—(۱۵۳)—

چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کی مانند، زخمِ دل گریبانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے، زلف کو اُلفت نے، عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

—(۱۵۴)—

وہ آ کے خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے؛
ولے مجھے، تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا!
تری طرح، کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے!
دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے، ساقی، جو ہم سے نفرت ہے:
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے!

—(۱۵۵)—

تپش سے میری، وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نورالعینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ، برخوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو:
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی،
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بو، بالش سے، اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے!
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالبؔ؟
کہ بیتابی سے، ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

—(۱۵۶)—

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشوونما، غالبؔ
اگر گل، سرو کے قامت پہ، پیراہن نہ ہوجاوے

—(۱۵۷)—

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے:
نالہ پابندِ نے نہیں ہے
ہرچند، ہر ایک شے میں تو ہے:
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

ہاں! کھائیو مت فریبِ ہستی:
ہرچند، کہیں کہ ''ہے''، نہیں ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے، زاہد؟
مے ہے: یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں، ہے!

—(۱۵۸)—

نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا
کہ اُس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں، تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ، کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

—(۱۵۹)—

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے:
مرتے ہیں؛ ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے

—(۱۶۰)—

کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟
یعنی اس بیمار کو نظّارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

—(۱۶۱)—

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟
ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے؟

زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے بھی اُنھیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟

سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں وہ، پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ "سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے؟"

اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟

—(۱۶۲)—

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے،
کرگئی وابستۂ تن، میری عریانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اُس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے!
میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے!
وعدہ آنے کا وفا کیجیے؛ یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے، میرے گھر کی دربانی، مجھے؟

—(۱۶۳)—

یاد ہے، شادی میں بھی ہنگامۂ "یارب"، مجھے
سُبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب مجھے

—(۱۶۴)—

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رَسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز، اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں؛ دیکھو، نہ کہیو پھر کہ "غافل تھے"
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

—(۱۶۵)—

کبھی، نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے، مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے؛
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

تکلّف برطرف! نظارگی میں بھی سہی؛ لیکن
وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے؟

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر، غالبؔ!
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!

—(۱۶۶)—

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں، تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا، مِرے آگے!
ہوتا ہے شب و روز تماشا، مِرے آگے!
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں، مِرے نزدیک؛
اک بات ہے اعجازِ مسیحا، مِرے آگے!
جز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور!
جز وہم، نہیں ہستیِ اشیا، مِرے آگے!
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا، مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا، مِرے آگے!
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مِرے آگے!
ایماں مجھے روکے ہے، تو کھینچے ہے مجھے کفر:
کعبہ مِرے پیچھے ہے، کلیسا مِرے آگے!
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مِرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا، مِرے آگے
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے!
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا، مِرے آگے!
ہے موجزن اک قلزمِ خوں؛ کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی، دیکھیے، کیا کیا، مِرے آگے؟
گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مِرے آگے!

کہوں جو حال، تو کہتے ہو "مدعا کہیے"
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے؟
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستم گر ہیں"
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا کہیے"
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے، اُس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے، اُس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں، حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کہیں، مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی، شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجیے
کبھی، حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان، تو خنجر کو "مرحبا" کہیے
نہیں نگار کو اُلفت؛ نہ ہو، نگار تو ہے:
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت؛ نہ ہو، بہار تو ہے:
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا، غالبؔ
خدا سے، کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے؟

—(۱۶۹)—

روئے سے، اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہوگئے!
صرفِ بہائے مے ہوئے، آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہوگئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا، ہم، گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے!

—(۱۷۰)—

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں، برائے خندہ ہے
دعویِ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے
شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر؛ ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

—(۱۷۱)—

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
افسردگی، نہیں طرب انشائے التفات
ہاں! درد بن کے، دل میں مگر جا کرے کوئی

چاکِ جگر سے، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رُسوا کرے کوئی؟
ناکامیِ نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے، عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی؟
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی

—(۱۷۲)—

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟
چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی!
بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے، خدا کرے! کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے!
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

—(۱۷۳)—

تمھاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم، کیا ہے؟
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

—(۱۷۴)—

باغ، پاکر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے:
سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں، اب مر گئے پر، کون اُٹھاتا ہے مجھے؟

—(۱۷۵)—

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم؛ ولے
کیوں کر نہ کھایئے، کہ ہوا ہے بہار کی؟

—(۱۷۶)—

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے!
بہت نکلے مِرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے!
ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یوں دم بدم نکلے؟
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں؛ لیکن
بہت بے آبرو ہوکر، تِرے کوچے سے ہم نکلے!
بھرم کھُل جائے، ظالم، تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے، کان پر رکھ کر قلم، نکلے
ہوئی، اس دور میں، منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں، نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے!
کہاں میخانہ کا دروازہ، غالبؔ، اور کہاں واعظ!
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

—(۱۷۷)—

جز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

—(۱۷۸)—

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں، ہے!

—(۱۷۹)—

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو، کان میں رکھتا ہے انگلی، جادہ سے

—(۱۸۰)—

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

—(۱۸۱)—

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں، یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

—(۱۸۲)—

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں، ساغر متاعِ دست گرداں ہے
غم، آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

—(۱۸۳)—

دل مدعی و دیدہ بنا مدعیٰ علیہ
نظارے کا مقدمہ، پھر، روبکار ہے
چپ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی، مجھے
وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟

—(۱۸۴)—

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے؟
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟
غالبؔ، برا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

—(۱۸۵)—

شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی، کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے؟
اے پرتوِ خُرشیدِ جہاں تاب، اِدھر بھی!
سایے کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے!
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے!

—(۱۸۶)—

اِک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ، تیرے شہیدوں پہ، حور کی

واعظ، نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی!

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے، ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟
آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

—(۱۸۷)—

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام، بہت ہے
یہ رنج، کہ کم ہے مَۓِ گلفام، بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو؛ مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
آلودہ بہ مے، جامۂ احرام، بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

—(۱۸۸)—

مدّت ہوئی ہے، یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے، بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع، پھر، جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے، دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
مانگے ہے، پھر، کسی کو لبِ بام پر، ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے، پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو
سرمے سے، تیز دَشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر، نگاہ
چہرہ، فروغِ مے سے، گلستاں کیے ہوئے
پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے
غالبؔ، ہمیں نہ چھیڑ؛ کہ پھر، جوشِ اشک سے،
بیٹھے ہیں ہم، تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست، جاں کے لیے!
رہی نہ طرزِ ستم کوئی، آسماں کے لیے

بلا سے، گر مژۂ یارِ تشنۂ خوں ہے!
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر!
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے: کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس، آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے، وہ چپ تھا؛ مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم، میں نے، پاسباں کے لیے

ادائے خاص سے، غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے، یارانِ نکتہ داں کے لیے

~~~~~~~~
~~~~~~~~

قصائد

سازِ یک ذرّہ نہیں، فیضِ چمن سے، بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ، سویدائے بہار

سبز ہے، جامِ زمرّد کی طرح، داغِ پلنگ
تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت، روے شرار

کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو باندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

لعل سی، کی ہے، پےِ زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ، کہ جس کی، پےِ تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل، ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مِروحۂ بالِ پری سے بیزار

—(۲)—

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں؟

بے دلی ہائے تماشا! کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا! کہ نہ دنیا ہے، نہ دیں

ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

مثلِ مضمونِ وفا، باد بدستِ تسلیم!
صورتِ نقشِ قدم، خاک بفرقِ تمکیں!

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں؛ لیکن
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

—(۳)—

ہاں، مہِ نو، سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو، جھک کے، کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے، دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایّام

اُڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا، دام

مرحبا! اے سرورِ خاصِ خواص
حَبّذا! اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں، تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے امیدگاہِ اَنام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو، تو ہو، اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام؟

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام؟

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دے گا مجھے مےِ گلفام؟

ق

جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع، تیری تیزیِ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں، لبریز
اپنی صورت کا اِک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کرچکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟

مے ہی، پھر، کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام؟

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں، ورنہ، غالبؔ اپنا نام؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال و الاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول، معنیِ الہام

بزم میں، میزبانِ قیصر و جم
رزم میں، اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا!
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بددور! خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ! عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے، قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے، مرشدِ جام

ق

مرحبا! موشگافیِ ناوک
آفریں! آبداریِ صمصام

تیر کو تیرے، تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری، تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند؟
برق کو دے رہا ہے کیا الزام؟

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

ق

فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

اُس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام؟

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایّام

اور اُن اوراق میں، بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے، احکام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی، بدستور، صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام!

صبح دم، دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا، گنجینۂ گوہر، کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر، کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا، ہر طرف، زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اِک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا

تھی نظر بندی؛ کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے، صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے، ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھلا

شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے
رازِ ہستی، اُس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

مجھ پہ، فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے؛ لیکن ہر ایک
میری حدِّ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیوں کر کھلا؟

باغِ معنی کی، دکھا دوں گا، بہار
مجھ سے، گر شاہِ سخن گستر، کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طلبۂ عنبر کھلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا؟
کاش کے! ہوتا قفس کا در کھلا

مفت کا، کس کو برا ہے، بدرّقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟
آگ بھڑکی، مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط، میری چھاتی پر، کھلا

دیکھیو، غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر، کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خُرشید کا دفتر کھلا

خامے سے پائی طبیعت نے مدد

بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر، کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رُتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا، ہوا ہے، روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طُغرل و سنجر کھلا

جانتا ہوں، ہے خطِ نوحِ ازل
تم پہ، اے خاقانِ نام آور، کھلا

تم کرو صاحبقرانی، جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا دَر کھلا!!

مثنوی در صفتِ انبہ

ہاں، دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟

خامے کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گُل کا ہے گلفشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہے، "کیا لکھیے؟"
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے، آموں کا کچھ بیاں ہوجائے
خامہ، نخلِ رطب فشاں ہوجائے

آم کا کون مردِ میداں ہے؟
ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟
آئے؛ یہ گوے اور یہ میداں!

آم کے آگے پیش جاوے خاک!
پھوڑتا ہے جلے پھپولے، تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا، انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو؛ تمھیں خبر کیا ہے؟
آم کے آگے نیشکر کیا ہے!

نہ گل اُس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار
جب خزاں آئے، تب ہو اُس کی بہار

اور دوڑایئے قیاس کہاں؟
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن، باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان،
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے، بحکمِ ربُّ الناس
بھر کے بھیجے ہیں، سر بہ مہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل!

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بو باس؟

آم کو دیکھتا، اگر اِک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہرو راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے، آم
ناز پروردۂ بہار ہے، آم

خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد
عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہِ جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور!
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو!
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو!

~~~~~~~~
~~~~~~~~

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانْو سے تیرے ملے فرقِ ارادت، اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت، اِکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے، عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے، دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا، حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش، مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم، مرنے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل، نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم، نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مِرا صفحہ، لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مِرا سینہ، ''اَمر'' کی زنبیل

فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل

نیک ہوتی مِری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مِری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر!
کعبۂ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!

—(۲)—

گئے وہ دن، کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی؟ جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں: ''کیوں ہم نہ کہتے تھے؟''

—(۳)—

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

—(۴)—

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ، کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالبؔ، خدا گواہ!
کہتا ہوں سچ؛ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

—(۹)—

افطارِ صوم کی کچھ، اگر، دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
جس پاس، روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے

—(۱۰)—

گرچہ از روے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں، لیکن اپنے جی میں، کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے، نوکر بھی ہوگیا، صد شکر!
نسبتیں ہوگئیں مشخّص چار

رسم ہے، مردہ کی چھماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں، تہائی کا
ہوگیا ہے شریک، ساہوکار

میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سیہ گلیم ہوں؛ لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ، مجھے
کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالبؔ ہے

رباعیات

(اُردو)

شبِ زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں؟ کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُرنم تھا

—(۲)—

ہے خلقِ حسد قُماش لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی: ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

—(۳)—

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

—(۴)—

کہتے ہیں کہ ''اب وہ مردم آزار نہیں
عشّاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں''
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا،
کیوں کر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں؟

—(۵)—

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں: ''کہیں خدا سے''، اللہ، اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

ооо

شرحِ غالبؔ

فارسی غزلیات

(اِس حصے میں اشعار کے حوالے کے لیے جو ہندسے استعمال کیے گئے ہیں، ان میں پہلے سے غزل نمبر اور دوسری سے شعر مراد ہے)

[۲:۴] اشارہ بمقامے کہ دوست، بعد از خرابیِ بصرہ، مستفسر احوال شدہ باشد (پنج آہنگ:۴۱)۔
''احوال'' کے متعلق قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں: ''حال'' کی جگہ ''حالات'' یا ''احوال'' لکھنا قبیح نہیں ہے، خصوصاً ''احوال'' کہ یہ بمعنیِ واحد مستعمل ہے اور یہ استعمال یہاں تک پہنچا ہے کہ ''احوال'' بمعنیِ جمع مستعمل نہیں ہوتا؛ جیسے ''حور'' کہ بمعنیِ ''حوراء'' کے، اہلِ فارس اس کو صیغۂ واحد قرار دے کر، الف نون کے ساتھ اس کی جمع لاتے ہیں... میں نے ایک مقطع میں، ''حال'' کی جگہ ''احوال'' لکھا ہے: جان غالب! تاب گفتاری گماں داری ہنوز، (خطوط:۱، ۱۸۱)۔

[۲:۹] لائق معاملۂ بیع وشرا، درصورتے کہ کاتب بائع ومشتری مکتوب الیہ باشد (پنج آہنگ:۴۴)۔

[۴:۱۰] اظہار نسبت ارادت بروشِ استفہام (ایضاً:۴۱)۔

[۳:۱۱] طلب نفقد بذریعۂ بخشایش برطمع خام (ایضاً)۔ آزردہ کے نام کے خط میں قدرے تغیر کے ساتھ، یہ شعر نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: قبلۂ حاجات! اگر ایں بندۂ اندک شنو، بسیار گوے، زود گستاخ، دیر پشیماں راحق بندگی نیست، از کجا کہ بریں بے بضاعتے تواں بخشود؟ گیرم وفا ندارد اثر، آہ (ایضاً:۱۲۳)۔

[۱:۱۲] نازش برنسبت تعارف، اگرچہ دوست غمخوار نباشد (ایضاً:۴۱)۔

[۴:۱۸] طاعت میں، تا، رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو، کوئی لے کر بہشت کو (انتخاب:۲۳۶)

[۴:۱۷] بیان ناسودمندیِ کوشش دربارۂ حصول مطلب (پنج آہنگ:۴۵ و نیز ۲۴۰)۔

[۵:۲۱] ذریعۂ ایں اندوہ، کہ اگر ملامت بجاسب، قطع نظراز تحسین ہنر چراست (ایضاً:۴۱)۔

[۴:۲۳] عذر گستاخی خواستن وقاعدہ ناشناسیِ خودرا شفیع جرأت ساختن (ایضاً:۴۵)۔

[۱:۲۴] بیان کلفت ناسازیِ بخت واندوہ پیش نیامدن دولت (ایضاً:۴۲)۔

[۱:۲۶] ''گل رعنا'' کے دیباچے میں فرماتے ہیں: ''بر گوشۂ سماط لفظ، ریزہ چنیں وکاسہ لیس گزشتہ جادو بیاناں، و بر طرف بساط معنی، خواجہ تاش وہم پیالۂ آنانم، چہ اگر دیگران را، از خزینۂ جود مبداء فیاض، لعل وگوہر بدامن فطرت مید ہند، مرا نیز خرمہرۂ چند در جیب وکنار اندیشہ می نہند، نگویم، تازہ دارم، آہ، (پنج آہنگ:۵۷)۔

[۴:۲۷] جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں: ''ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا؟'' (انتخاب:۲۰۵)
کبھی، نیکی بھی اس کے جی میں، گر آجائے ہے، مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے (ایضاً:۷۷)

[۲:۵۲] شرح شدت بے برگ ونوائے بردوش خاص (پنج آہنگ:۴۵)۔

[۲:۵۳] مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں: ''سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو۔ گمان زیست بود برمنت ز بیدردے، آہ (خطوط:۱،۹۱)۔ انھیں کو دوسرے خط میں تحریر کیا ہے: ''میرا عجب حال ہے۔ حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا؟ گمان زیست برد، آہ۔ سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی، (ایضاً:۹۶)۔ علائی کے خطوں میں بھی یہ شعر استعمال کیا ہے (اُردو:۴۱۶ و ۴۲۹)۔

[۱:۵۴] اس غزل کے عنوان پر، میرزا صاحب نے اپنے قلم سے لکھا ہے: ''عاشق ہونا معشوق کا'' (انتخابِ فارسی، مخطوطہ، ق:۸ب)۔

[۴:۵۶] ترحم دوست رانسبت بخویش از ساختگی گماں کردن (پنج آہنگ:۴۲)۔

[۱:۶۲] یہ شعر میرزا صاحب نے آخر عمر میں اکثر خطوں کے اندر درج کیا ہے۔ سرور کو لکھتے ہیں: ''کاش! وہ میری رنجوری کا حال کہتے، ضعف واضمحلال کہتے: تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا، ان کی غمخواری اور دردمندی نوازی کا دم بھرتا۔ ہے، ہے! درکشاکش ضعفم نگسلد، آہ'' (اُردو:۱۴۷ و عود:۴۱)۔ نواب انورالدولہ بہادر، شفق، کو تحریر فرماتے ہیں: ''آپ کی پرسش کے

کیوں نہ قربان جاؤں؟ کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا، میری خبر نہ لی۔ میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور، مثلہ، میری یہ تحریر، آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ درصورتِ مرگ، نیم مردہ اور درحالتِ حیات، نیم زندہ ہوں۔ درکشاکش ضعفم، آہ" (ایضاً:۲۹۶ و ایضاً:۱۱۹)۔ قدر بلگرامی کو لکھا ہے: "میں اب اچھا ہوں۔ برس دن صاحبِ فراش رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم خوں چکاں۔ ایک درجن پھائے لگ جاتے تھے۔ جسم میں جتنا لہو تھا، پیپ ہو کر نکل گیا۔ تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے، وہ کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی کھاتا ہوں، کبھی پیتا ہوں۔ مرض کے آثار میں سے اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پانوؤں کی دو دو انگلیاں بڑی ہوگئی ہیں، معہذا متورم ہیں، جوتا نہیں پہنا جاتا۔ ضعف کا تو بیان ہو ہی نہیں سکتا، مگر ہاں یہ میرا شعر: درکشاکش ضعفم، آہ (خطوط: ۱،۱۹۵)۔

[۲:۶۴] خاطر دوست را، بدور باش دوستانہ، آزردن و بہ گستاخی و بیدردی کار از پیش بردن (پنج آہنگ:۴۲)۔

[۲:۶۵] سزاوار مقامے کہ دوست پاسخ نامہ نگاشتہ باشد و جواب اصل مدعا فرو گزاشتہ باشد (ایضاً: ۴۳)۔

[۲:۶۶] پردہ کشائیِ راز افلاس بانداز عاشقانہ (ایضاً:۴۵)۔

[۲:۷۰] دوست را، نظر بہ بے التفاتے، بہ بید تشبیہ دادن وازاں نیز ترقی کردن (ایضاً:۴۳)۔

[۱:۸۱] "داشتن" بمعنی رکھنے کے ہے، لیکن اہلِ زبان بمعنی "بایستن" بھی استعمال کرتے ہیں۔ ظہوری:

گر اسیر زلف و کاکل گفتہ باشم خویش را
گفتہ باشم؛ ایں قدر بر خویش پیچیدن نداشت

میرے شعر میں پہلے مصرعے کا "داشت" بمعنی رکھنے کے اور دوسرے مصرعے کا "داشت" بمعنی "بایست" ہے۔

مفہوم شعر یہ کہ دوست ایسا حیلہ ڈھونڈتا تھا کہ اس کے ذریعے سے مجھ پر خفا ہو۔ چاہتا تھا کہ آزردہ ہو، مگر سبب نہیں پاتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد، رقیب سے معشوق کو ملال ہوا۔ میری جو شامت آئی، میں نے دوست سے پوچھا کہ "رقیب نے کیا گناہ کیا، جو راندۂ درگاہ ہوا؟" معشوق اسی گستاخی کو بہانۂ عتاب ٹھہرا کر، آزردہ ہوگیا۔ اب شاعر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے: "ہائے! پرسیدن نداشت"، یعنی: پوچھنا نہ چاہیے تھا (اُردو ۳۸۹، لاہوری اڈیشن)۔

[۱:۸۲] بیان تنعم دوست و بے برگی خود و طلب تفقد (پنج آہنگ:۴۳)۔

[۲:۸۸] کلیاتِ فارسی کے دیباچے میں یہ شعر لکھ کر فرماتے ہیں: لاے خم میخانہ سرمدی نسبت ناچشیدگاں سگالند کہ ہیچمدانی راایں مایہ سیاریِ نطق از کجاست؟ غافل کہ نم رشحۂ یک فیض است کہ سبزہ را دمیدن، ونہال را سر کشیدن، ومیوہ را رسیدن، ولب را زمزمہ آفریدن آموخت، (نول کشور اڈیشن، طبعِ اوّل:۴)۔

[۲:۹۱] بایستہ بمقامے کہ دوست اندوہ دوست رااندک ساختہ باشد (پنج آہنگ:۴۳)۔

[۱:۹۲] بیان بقیہ کلفت واندوہ وملال بعد سپرے شدن روزگارے دراز در غم و درد (ایضاً:۴۵)۔

[۱:۹۴] پیش آمدن کار مشکل بجاے خطرناک (ایضاً:۴۲)۔

[۳:۹۷] بیان ایں معنی کہ اندک آسایش وفراغ خاطر وصفاے وقت اگر میسر آید، تن بزحمت جستجو نباید داد، و بہ بند گرد آوردن مال نباید افتاد (ایضاً:۴۳)۔

[۴:۱۰۰] تعلیم تسلیم (پنج آہنگ:۴۳)۔

[۴:۱۰۳] در آزردگیِ دوست خود را بعلاقہ تعلق تسلی دادن (ایضاً:۴۶)۔

[۲:۱۰۶] شایستہ بمقامے کہ ایں کس، بسبب طول زمان انتظار، از معاودت قاصد مایوس شدہ باشد (ایضاً)

[۱:۱۱۱] سزاوار بحال کسے کہ از تنعم وتمول بر آمدہ، در تلاشِ معاش افتادہ باشد (ایضاً)۔

[۴:۱۱۴] "نامۂ غالب" میں لکھتے ہیں: "اگر مجھ سے کوئی کہے کہ "غالب، تیرا بھی مولد ہندوستان ہے"، میری طرف سے جواب یہ ہے کہ "بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے۔ ہر چہ از دستگۂ پارس بہ یغما بردند، آہ۔ زبان دانیِ فارسی میری ازپےِ دستگاہ اور بہ عطیۂ خاص من جانب اللہ ہے۔ (عود:۱۴۴)۔

[۳:۱۱۵] اس شعر کے متعلق شاکر کو لکھتے ہیں: "فقیر ہمیشہ موردِ اعتراضات رہا ہے، لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ بعد دو چار دن کے، معترض صاحب کا خط آیا ہے، لغت وترکیب معترض فیہ کی سند کے اشعار حضرت نے اس خط میں درج کیے ہیں۔ اللہ اللہ! جو کلکتے میں شور نشور اٹھا تھا۔ میرا شعر: جزوے از عالم واز ہمہ عالم بیشم، آہ، خستۂ جراحت ہاے اعتراض ہوا ہے۔ منشاے اعتراض یہ کہ عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ بحسب اجتہاد قتیل نموع ہے۔ قضارا، اس زمانے میں شاہزادۂ کامران درانی کا سفیر گورمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے اشعار پان سات ایسے پڑھے، جن میں "ہمہ عالم و ہمہ روز و ہمہ جا"

مرقوم تھا، اور وہ اشعار 'قاطع برہان' میں مندرج ہیں۔ (عود: ۱۷۸ و ۱۷۹)۔

[۲:۱۱۹] تسکین خاطر دوست، باظہار قرب زمان ہلاک خویش (پنج آہنگ: ۴۳)۔

[۱:۱۲۲] آغاز جواب مکتوب، بشکر یاد آوریِ محبوب (ایضاً)۔

[۲:۱۲۵] اختصار در درد دل بہ وانمودن یک مثال (ایضاً: ۴۴)۔

[۳:۱۳۰] تباہی خود را مقصود دوست دانستن و بداں شادماں بودن (ایضاً)۔

[۲:۱۳۳] از پاس ادب ستوہ آمدن و رخصت شکوہ طلبیدن (ایضاً: ۴۳)۔

[۲:۱۳۴] شعرے کہ آغازِ بیان شکایت بداں تواں کرد (ایضاً: ۴۶)۔

[۳:۱۳۷] اظہار آمادہ بودن خویش بدعاے بد، یا تظلم و استغاثہ (ایضاً)۔

[۲:۱۳۸] انکار ظہور اعانت و اقرار حصول مدعا محض بسابقۂ عنایت ازلی (ایضاً)۔

[۲:۱۴۳] درمقام ایں مثل کہ گوئی: ''ہنوز روزِ اول است'' (ایضاً: ۴۵)۔

[۱:۱۴۶] بیان شدت غم (ایضاً: ۴۴)۔

[۳:۱۵۵] طلب تفقد باظہار عزم آوارگیِ خویش (ایضاً: ۴۳)۔

[۳:۱۵۹] مفتی غلام غوث خاں بہادر بیخبر کو لکھا ہے: ''قبلہ! میرا ایک شعر ہے: خود پیش خود کفیل گرفتاریِ منست، آہ۔ یہ معاملہ میرا اور آپ کا ہے، خارج سے مسموع ہوا ہے کہ میں نے جو اغلاط ''برہانِ قاطع'' کے نکال کر، ایک نسخۂ موسوم بہ ''قاطعِ برہان'' لکھا ہے اور ایک مجلد اس کا آپ کو بھی بھیج دیا ہے، آپ اس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں۔ اگر چہ باور نہیں آیا، لیکن عجب آیا۔ (اُردو: ۲۸۵، نیز پنج آہنگ: ۴۳۶)۔

[۱:۱۶۷] ''انگبین'' شہد کو کہتے ہیں، اور ''تبرزد'' مصری کو کہتے ہیں۔ ان معنوں میں کہ یہ مانند قند اور بتاسوں کے جلد ٹوٹنے والی نہیں۔ جب تک اس کو تبر سے نہ توڑو، مدعا حاصل نہیں ہوتا۔ ''بدر زدن'' اگر چہ لغوی معنی اس کے ہیں باہر مارنا، یعنی: بدر، باہر اور زدن، مارنا؛ لیکن روزمرہ میں اس کا ترجمہ ہے: نکل جانا۔ اب جب یہ معلوم ہو گیا تو یوں سمجھیے کہ معشوق کے ہونٹوں کو میٹھا کہتے ہیں اور قند اور مصری اور شہد سے نسبت دیتے ہیں، اور البتہ مکھی مٹھاس کی عاشق ہے۔ پس جو مکھی کہ مصری پر بیٹھے، وہ جب چاہے بے تکلف اڑ جائے، اور جو مکھی کہ شہد پر بیٹھے گی، جب اڑنے کا قصد کرے گی، پَر و بال اس کے شہد میں لپٹ جائیں گے اور وہ مر کر رہ جائے گی۔

بس اب یہ کہنا ہے کہ میرے معشوق کے ہونٹ شیرینی میں میرے واسطے شہد ہو گئے اور رقیب کے واسطے مصری، یعنی: وہ چاٹ کر، لطف اٹھا کر، صحیح وسالم چلا گیا، اور میں پھنس کر، وہیں مر کر، رہ گیا (اُردو: ۳۹۰، لاہور اڈیشن)۔

[۲:۱۶۷] یہ خیال ہے، یعنی: ایک گھر میں اس کا محبوب بیٹھا ہوا ہے، اور اس نے جان لیا ہے کہ کون ہے؛ مگر بطریقِ تجاہل بھولا بن کر پوچھتا ہے کہ ''آیا، اس گھر میں ایسا کون ہے کہ مہر، یعنی: آفتاب، نے اپنے سانس کے ٹکڑے، فرطِ شوق سے، دروازے کے روزن پر پھینک دیے ہیں؟'' آفتاب کے خطوط شعاعی کا روزنوں میں پڑنا اور ان خطوط شعاعی کا، یعنی: سورج کی کرن کا، بہ صورت سانس کے ٹکڑوں کے ہونا ظاہر ہے (ایضاً: ۳۹۱)۔

[۳:۱۶۷] ''خندۂ دنداں نما'' اس ہنسی کو کہتے ہیں، جو تبسم سے بڑھ کر ہو، اور اس میں دانت ہنسنے والے کے دکھائی دیں۔ معشوق موتیوں کے حسن پر ہنسا، اور ہنستا کوئی اس چیز پر ہے، جس کو اپنے نزدیک ذلیل سمجھ لیتا ہے۔ حاصل معنی یہ: کہ میرا معشوق موتیوں کے حسن پر ہنسا، گویا، اس نے یہ دعویٰ کیا کہ موتی اچھی چیز نہیں۔

اب دعوے کے واسطے دلیل ضرور ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے معشوق کے دعوے پر دلیل بدیہی ہے۔ یعنی: ہنسنے میں اس کے دانت نظر آئے؛ معلوم ہوا کہ وہ حسن، جو لوگ موتی میں گمان کرتے تھے، وہ لغو ہے؛ حسن یہ ہے کہ جو معشوق کے دانتوں میں ہے (ایضاً)

[۴:۱۶۷] یہ گستاخانہ اپنے پروردگار سے کہتا ہے کہ جب اس عالم میں تو نے میری داد نہ دی، اور میری خواہشیں پوری نہ کیں، تو بس اب معلوم ہوا کہ میں لائق التفات کے نہ تھا، پس جب میں لائق توجہ کے نہیں، تو اب عالمِ عقبیٰ میں میرے گناہوں کا مواخذہ کیا ضرور ہے؟ جب ہمارے مطالب آپ نے ہم کو نہ دیے، تو ہمارے معاصی کا بھی شمار نہ کیجیے۔ جانے دیجیے۔ ہم میں التفات کی ارزش نہیں (ایضاً: ۳۹۲)۔

[۲:۱۷۲] باعثِ ترک صحبت را مجملاً خاطر نشاں ساختن وتفصیل آں را بہ بیان ہمدماں حوالہ کردن (پنج آہنگ: ۴۴)۔

[۳:۱۸۴] اظہار وفاے خویش نسبت بحاکم یا بدوست (ایضاً: ۴۳)۔

[۴:۱۸۴] طلب تفقد بطریق تنزل (ایضاً: ۴۴)۔

[۲:۱۸۶] بیان انتظار قاصد درامر مذبذب (ایضاً: ۴۱)۔

[۵:۱۹۸] اظہار حسن عقیدت بمقابلۂ بے پروائیِ دوست (ایضاً:۴۴)۔

[۱:۱۹۹] وصف لکنت زباں (ایضاً:۴۲)۔

[۵:۱۹۹] خواہش حیات خود از جانب دوست از محبت نشمردن، وآں را بر شدت بیدردی گماں بردن (ایضاً:۴۲)۔

[۲:۲۰۵] اس غزل کے بارے میں شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کو لکھا ہے: ''غزلے کہ اندریں روزہا بتازگی درروش تازہ گفتہ ام، بعد عذر خواہی۔ تقصیر کوتہ قلمی، برحاشیۂ مکتوب می نگارم، وچشم آں دارم کہ داغ محرومیِ قبول نہ بیند، واز دیدہ بدل جا گزیند'' (ایضاً:۱۴۳)۔

[۱:۲۲۸] خواہش وصل وتقاضاے عیش (ایضاً:۴۱)۔

[۱:۲۶۰] استدعای عنایت بہ نہیب قطع محبت (ایضاً:۴۴)۔

[۱:۲۶۸] ''مان''، مع النون، بمعنیِ ''مارا'' مستعمل اہلِ زبانست (حاشیۂ آ: ق،۳۴ب)۔ و در ب: ''یعنی مارا'' (ق،۱۱۱،الف)۔ و بہر دو جا بخط خود غالب است۔

[۲:۲۶۸] ''مان''، صیغۂ امر از ماندن (ایضاً)، و در ب: ''یعنی بگزار'' (ق،۱۱۱ب)۔ و بہر دو جا بخط خود غالب۔

[۵:۲۷۴] گزارش شدت رنج وغم بطریق ترقی (پنج آہنگ:۴۲)۔ اس غزل کے بارے میں امین الدین کو لکھتے ہیں: ''حالیا غزلے ہم ازاں اوراق نگاشتہ می شود، تا از سوز دروں نامہ نگار خبر تواند داد'' (ایضاً:۱۸۲)۔

[۴:۲۷۹] درموقع تعلیم صبر وشکیبائی (ایضاً:۴۳و۱۲۲)۔

[۱:۲۸۵] حوالۂ مادۂ شکایت بوجدان ضمیر مکتوب الیہ (ایضاً:۴۲)۔

[۵:۲۹۶] ''لیلی نکوہ''، بدگویندۂ لیلی (حاشیۂ آ: ق،۳۸ب، بخطِ غالب)۔

[۲:۲۹۷] درخوربیان گلۂ بدعہدی وگزاف پیشگیِ دوست (پنج آہنگ:۴۱)۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

فارسی رباعیات

(اِس حصے میں اشعار کے حوالے کے لیے جو ہندسے استعمال کیے گئے ہیں، ان سے رباعی نمبر مراد ہے)

[۲] مولوی سراج الدین احمد کے نام کے خط میں فرماتے ہیں: ''در سخن از پرورش یافتگان مبداء فیاضم، وسواد معنی را بفروغ گوہر خویش روشن کردہ ام۔ از ہیچ آفریدہ، حق آموزگاریم بگردن، وبار منت رہنمائیم بردوش، نیست۔ غالب بگہر ز دودۂ زادشمم، آہ'' (ایضاً: ۱۵۵)۔

[۹] اس رباعی کے متعلق حکیم مومن خاں مرحوم کو لکھا ہے: ''فروغ طالع گفتار، سلامت! دوش، اندیشۂ دیوانگی پیشہ، باروشناں سپہر سرزنشی کہ بہ پُرخاش انجامد، آغاز کرد، وتیغ دودمۂ چار مصرع ایں رباعی درمیانۂ آں ہفت فروزندہ پیکر بنہاد۔ آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقی دہر، آہ''۔ (ایضاً: ۱۲۵)

[۱۴] ذکا کو ایک مکتوب، مورخہ ۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء، میں لکھا ہے: ''ہر شخص نے بقدرِ حال ایک ایک قدردان پایا۔ غالب سوختہ اختر کو ہنر کی داد بھی نہ ملی۔

کسم بخود نہ پذیرفت ودہر بازم برد　　　چو نامۂ کہ بود نانوشتہ عنوانش

یہ شعر میرا ہے، ولی عہد خسروی دہلی، میرزا فتح الملک بہادر مغفور کے قصیدے کا، اور دیکھو ایک رباعی میری: دستم بکلید مخزنے می بایست، آہ'' (اُردو: ۴۲)۔

[۱۷] دیباچۂ سراج المعرفت، مصنفۂ مفتی سیّد رحمت علی خاں بہادر، عرف مفتی میر لال، میں میرزا صاحب نے لکھا ہے: ''سچ بھی تو ہے، آدمی کیوں کر سمجھ سکے، اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اس کو کیوں کر تسلی ہو؟ یعنی اس مجموع موجودات کو، کہ افلاک وانجم و بحار و جبال اسی میں ہیں، نیست ونابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے۔ اے کردہ بآرایش گفتار بسیج، آہ''

(اُردو: ۳۴۷، لاہوری اڈیشن، نیز پنج آہنگ: ۲۲۶ و کلیات نثر فارسی: ۲۵۹)۔

[۱۸] اس رباعی کے متعلق سرور کو لکھا ہے: ''میں پانچ سات برس سے بہرا ہو گیا ہوں۔ ایک رباعی چار قافیے کی اس مضمونِ خاص کی میں نے لکھی ہے، برعایت صنعت ذوقافیتین۔ دارم دل شاد و دیدۂ بینائی، آہ'' (عود: ۱۱)۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

اردو غزلیات

(اِس حصے میں اشعار کے حوالے کے لیے جو ہندسے استعمال کیے گئے ہیں، ان میں پہلے سے غزل نمبر اور دوسری سے شعر مراد ہے)

[۳:۱۰] نہ پوچھ بیخودیِ عیش مقدم سیلاب کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر، در و دیوار

[۱:۱۳] میرزا صاحب کے مکتوب بنام سرور کے اس حصے سے شعر کے مضمون پر روشنی پڑتی ہے:

''بندہ پرور! میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا، کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے، جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ 'مجموعہ ہاے پریشاں' بھی غارت ہوئے'' (عود: ۲۷)۔

[۲:۱۴] ملاحظہ ہو، ۲:۱۵۔

[۱:۲۰] یہی مضمون اس شعر میں نظم کیا ہے:

رنج نومیدیِ جاوید گوارا رہیو! خوش ہوں، گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

اس غزل کے متعلق مہر کو لکھا ہے: ''میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا، انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔

کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر، کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا'' (اُردو: ۲۵۹ و عود: ۱۰۸)۔

[۱:۲۴]   ملاحظہ ہو،۹۲: ۴،۹۵: ۶،۱۸۹: ۴۔

[۱:۲۶]   یہی مضمون اس شعر میں بھی نظم ہوا ہے:

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل!   بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہائے گل

[۱:۲۸]   اسی مضمون کو قدرے تغیر کے ساتھ باندھتے ہیں:

پژارہ، اے دل وابستہ! بیتابی سے کیا حاصل؟   مگر، پھر، تاب زلف پرشکن کی آزمائش ہے؟

[۴:۲۸]   ملاحظہ ہو، ۸۰: ۵۔

[۴:۳۰]   ملاحظہ ہو، ۹۲: ۱۔

[۶:۳۵]   فارسی میں بھی تقریباً یہی مضمون لکھا ہے:

غالب، نخورد چرخ فریب، ار ہزار بار   گفتم: ''بروزگار سخنور چومن بسیست''

[۲:۳۷]   ملاحظہ ہو، ۱۴۰: ۱۔

[۱:۳۸]   اس غزل کے پانچ شعر ''مہر'' کو لکھ کر، مطلع کے بارے میں فرمایا ہے: ''دیکھنا، بھائی! اس غزل کا مطلع کیا ہے:

جور نے باز آئیں، پر باز آئیں کیا؟   کہتے ہیں: ''ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟''

(اُردو: ۲۶۶ وعود: ۱۱۲، مگر پہلے مصرعے کے الفاظ آدب سے کسی قدر مختلف ہیں)

[۵:۳۸]   ''سرور'' کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''میں تو اب روز و شب اس فکر میں ہوں کہ زندگی تو یوں گزری، اب دیکھیے، موت کیسی ہو؟ عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ، آہ۔ میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسبِ حال ہے'' (اُردو: ۱۳۹ وعود: ۳۲)۔

[۱:۴۳]   ملاحظہ ہو، ۵۸: ۱۔

[۷:۵۰]   ملاحظہ ہو، ۵۸: ۳۔

[۳:۵۶]   ''میرزا تفتہ'' کو لکھا ہے: ''کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا، جس کو اتار کر پھینک گئے؟ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی، بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہوگا۔ سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو، اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو: تاب لائے ہی بنے گی غالب، آہ'' (اُردو: ۱۰۸)۔

''علائی'' کو تحریر کیا ہے: ''بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر خبردار، میرا سلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے۔ اسی کو غنیمت جانتا ہوں: تاب

لائے ہی بنے گی غالب، آہ" (ایضاً:۳۹۳)۔

[۱:۵۸] ملاحظہ ہو، ۱:۴۳۔

[۳:۵۸] ملاحظہ ہو، ۷:۵۰۔

[۱:۷۴] ملاحظہ ہو، ۲:۱۰۸۔

[۲:۷۴] ملاحظہ ہو، ۵:۱۵۰۔

[۴:۷۶] میرزا صاحب نے ایک خط میں تفتہ کو لکھا ہے: "یعنی: "اب جو دور مجھ تک آیا ہے، تو میں ڈرتا ہوں"، یہ سارا جملہ مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں، مگر "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد"، یہ فرق البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں" (اردو: ۲۶۹ لاہوری اڈیشن، ۱۹۳۷ء و خطوط ۱:۲۵)۔

[۱:۷۹] ملاحظہ ہو، ۴:۱۵۰۔

[۲:۷۹] یہ شعر، قدرے تغیر کے ساتھ، شاہ عالم صاحب مارہروی کے خط میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقیدِ مارہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہش وصل مقدر ہے، جو مذکور نہیں" (اُردو:۲۰۰)۔

[۵:۸۰] ملاحظہ ہو، ۴:۲۸۔

[۱:۸۶] اس غزل کے متعلق منشی شیونرائن کو اپریل ۱۸۵۹ء میں لکھا ہے: "ایک دوست کے پاس اُردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہنچا لیے ہیں۔ چناں چہ "پنہاں ہو گئیں، ویراں ہو گئیں" یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آ گئی ہے" (اُردو: ۳۶۸)۔

[۲:۸۷] "یعنی: اگر تیرا ملنا آسان نہیں، تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر، تیرا ملنا آسان نہیں، نہ سہی، نہ ہم مل سکیں گے، نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں۔ یعنی: جس سے تو چاہتا ہے، مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا، مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے" (عکس خطِ غالب، دیوانِ اُردو، بدایوں ایڈیشن، ۱۹۲۳ء)۔

[۳:۸۹] ملاحظہ ہو، ۱:۱۰۶۔

[۵:۹۰] اس غزل کے متعلق قاضی عبدالجمیل بریلوی کو لکھتے ہیں: "دل ہی تو ہے، آہ، ایک دوست کے پاس بقیۃ النہیب والغارہ کچھ میرا کلام موجود ہے، اس سے یہ غزل لکھوا کر بھیج دوں گا" (اُردو: ۲۱۲)۔ اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں: "مولوی صاحب، کیا لطیف معنی ہیں! داد

دینا۔ حسن عارض اور حسن ظن، دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی: صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے، کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے، کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیرِ غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو اپنے پر ایسا بھروسا ہے، تو رقیب کا امتحان کیوں کرے؟ اس حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی؛ ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشقِ صادق نہ تھا، ہوسناک آدمی تھا۔ اگر پائے امتحان درمیاں آتا، تو حقیقت کھل جاتی'' (عکسِ خطِ غالب، دیوانِ اُردو، بدایوں اڈیشن، ۱۹۲۳ء)۔

[۱:۹۲] ملاحظہ ہو، ۴:۳۰۔

[۲:۹۳] اس مضمون کو حسبِ ذیل بیت میں بھی باندھا ہے:

کیا زہد کو مانوں؟ کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

[۴:۹۳] ملاحظہ ہو، ۱:۴۲، ۶:۹۵، ۴:۱۸۹۔

[۱:۹۴] ملاحظہ ہو، ۱:۱۱۶۔

[۱:۹۹] علائی کو تحریر کیا ہے: ''تمھارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمھارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش! اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے... تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو، آہ'' (اُردو: ۶: ۴۳۳)۔

[۱:۱۰۱] مہر کو لکھتے ہیں: ''پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم واندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بیدرد پر دل آیا ہے، تو شکایت کی کیا گنجائش ہے؟ بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں، درخورِ افزائش ہے، بقولِ غالب علیہ الرحمۃ:

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

ہے، ہے! حسن مطلع:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے!
ہوا تو دوست جس کا، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے۔ اور اگر، خدانخواستہ باشد، غمِ دنیا ہے، تو بھائی، ہمارے ہمدرد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ اٹھا رہے ہیں، تم بھی اٹھاؤ، اگر مرد ہو۔ بقولِ غالب مرحوم:

دلا! یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے، کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہ نیم شبی ہے (اردو: ۲۶۸ و عود: ۱۱۰)

[۱:۱۰۶] مہر کے نام کے خط میں ارشاد ہوتا ہے: ''جناب مرزا صاحب! دلی کا حال تو یہ ہے: گھر میں تھا کیا جو ترا غم، آہ، یاں دھرا کیا ہے، جو کوئی لوٹے گا۔ وہ خبر محض غلط ہے۔ (ایضاً: ۲۷۰ و ایضاً: ۳۴۴) نیز ۲۳۴:۱ ملاحظہ ہو۔

[۲:۱۰۸] ملاحظہ ہو، ۷۴:۱۔

[۳:۱۰۷] ملاحظہ ہو، ۱۵۷:۳۔

[۲:۱۱۶] ملاحظہ ہو، ۹۴:۱۔

[۳:۱۱۹] اس کے ساتھ یہ شعر بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گماں تسلّی کا — نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیوں کر ہو؟

[۴:۲۵۰] میر مہدی کو لکھتے ہیں: ''قرۃ العینین، میر مہدی و میر سرفراز حسین، مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو، ہمیں خط نہیں لکھتا۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں — کاش! پوچھو کہ ماجرا کیا ہے

ماجرا یہ ہے کہ تمھارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا، میں جس کا جواب لکھتا'' (اُردو: ۱۶۰)۔

[۱:۱۲۵] ملاحظہ ہو، ۱۵۹:۱۔

[۴:۱۲۵] اسی کا ہم مضمون یہ شعر ہے:

ہم نشیں! مت کہہ کہ ''برہم کر نہ بزمِ عیش دوست''
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

[۴:۱۲۸] یہی مضمون اس طرح بھی نظم کیا ہے:

نظارہ کیا حریف ہو، اس برقِ حسن کا — جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے؟

[۱:۱۳۰] اس میں کوئی اشکال نہیں۔ جو لفظ ہیں، وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا مقصود کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا؟ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا۔ خدا جانے، شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر، فقیر ہو کر، بیٹھ رہے، یا دیس چھوڑ، پردیس چلا جائے (خطوط: ۱، ۱۲۷)۔

[۲:۱۳۰] نواب انورالدولہ بہادر، شفق، کو تحریر کیا ہے: ''یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں گرمی میں

میرا حال بعینہٖ وہ ہوتا ہے، جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا، خصوصاً اس تموز میں کہ غم وہم کا ہجوم ہے۔ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں، آہ'' (اُردو:۳۱۱)۔

[۵:۱۳۰] میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں: ''وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے: ہو چکیں، غالب، بلائیں سب تمام، آہ۔ میاں، سنہ ۱۲۷۷ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا'' (اُردو:۱۸۶، وعود:۹۰)۔

[۳:۱۳۱] میرزا صاحب نے یہ اشعار لطیف احمد بلگرامی کے نام کے خط میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''فخر ایجاد و تکوین، مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے، غالب نیم مردہ نیم جاں رہ جائے! مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی، آہ۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی، آہ۔ اگر جوان ہوتا اور بیمار، تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا۔ اسّی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں۔ دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ شراب کمبخت اب بھی چھوٹتی نہیں۔ نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں''۔

(اُردو:۴۲۰، لاہوری اڈیشن)

[۱:۱۴۰] ملاحظہ ہو، ۲:۳۷۔

[۲:۱۴۱] میرزا صاحب نے نواب انورالدولہ بہادر، شفق کے خط میں یہ شعر نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''پیر و مرشد! بارہ بجے تھے، میں، ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا، حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا، تو میں گریباں پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا۔ مری بھی سنیے۔ آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا۔ اس کی رسید آئی۔ کئی کٹے ہوئے شعر الٹے آئے۔ ان کی قباحت پوچھی گئی۔ قباحت بتائی گئی۔ الفاظ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دیے گئے۔ لو، صاحب، یہ اشعار بھی قصیدے میں لکھ لو۔ اس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرارالحق کے نام کا کاغذ ان کو دیا۔ جواب میں جو کچھ انھوں نے زبانی فرمایا، ''آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا:

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا

اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے؟

سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں۔ خیر، اب بہت دن کے بعد شکوہ کیا لکھا جائے'' (اُردو:۳۰۳ وعود:۶۰)۔

اسی خیال کو میرزا صاحب نے حسبِ ذیل شعروں میں بھی ادا کیا ہے:

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

تم اپنے شکوے کی باتیں، نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے، کہ اس میں آگ دبی ہے

[۲:۱۴۴] ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء کو، مولوی احمد حسن قنوجی کے خط میں لکھتے ہیں: ''یہ درویش گوشہ نشیں تمھارا دوست اور تمھارا دعا گو ہے۔ تمھاری نثر کی طرز پسند، تمھاری خواہش مقبول، جناب حکیم سیّد احمد حسن صاحب کی خدمت گزاری منظور۔ عشق نے، آہ۔ ۶۵ برس کی عمر ہوئی، اضمحلالِ قویٰ، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ، جو آپ مجھے دیکھ گئے ہیں، میں اب وہ نہیں ہوں''۔
(اُردو: ۲۳۹)

میرزا تفتہ کے نام کے خط، مورخہ ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء میں یہ شعر بہ تغیر نقل ہوا ہے۔ میرزا صاحب لکھتے ہیں: ''بھائی! مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی، لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں... نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
(اُردو: ۹۹)

[۳:۱۴۷] ''تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا؟ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، و وجود و عدم، لفظ: مقابل، اس مصرعے میں بمعنیِ مرجع ہے؛ جیسے، حریف کہ بمعنیِ دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہومِ شعر یہ کہ ہم اور دوست از روے خوے و عادت ضد ہم دگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رُک گیا۔ (عود: ۱۵۸)۔

[۳:۱۵۰] در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

[۴:۱۵۰] ملاحظہ ہو، ۱:۷۹۔

[۵:۱۵۰] یوسف مرزا کو تحریر کیا ہے: ''بھائی! میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہوئے، اور وہ سوا لاکھ روپیہ، جو علاوہ زرِ مقررہ ملا ہے، وہ دلی کی املاک کا خوں بہا ہے۔ پرسوں ناظر جی کے نام کے سرنامے میں فرد فہرست مجموع املاک بھیج چکا ہوں۔ خیر، یہ وار بھی خالی گیا۔ مولانا غالب علیہ الرحمہ، خوب فرماتے ہیں: منحصر مرنے پہ ہو، آہ'' (اُردو: ۳۴۷)۔

سرور کو لکھتے ہیں: حضرت! سچ تو یوں ہے کہ غم ہاے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی، پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچا ہوں: ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں، یوں ہی رویا کروں گا؛ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دلنشیں ہے۔ نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ ہیہات! منحصر مرنے پہ ہو، آہ" (ایضاً: ۱۴۷)۔

[۲:۱۲۵] اس کے ساتھ یہ شعر بھی قابلِ ملاحظہ ہے:

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا　　قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

اس غزل کی شانِ نظم کے بارے میں میرزا صاحب لکھتے ہیں: "پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے:

پلادے اوک سے ساقی، آہ،

مقطع یہ:

اسد، خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے　　کہا جو اس نے: 'ذرا میرے پانو داب تو دے'

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر، اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے، غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا، اور پانچ شعر کسی الو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں، تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو" (اُردو: ۴۴۲)۔

[۳:۱۵۸] ملاحظہ ہو، ۱۱۱: ۳۔

[۱:۱۵۹] ملاحظہ ہو، ۱۰۹: ۲۔

[۴:۱۶۲] ملاحظہ ہو، ۱۶۶: ۱۔

[۹:۱۶۷] ۷؍فروری ۱۸۵۸ء کو مجروح کے خط میں فرماتے ہیں: "میرا حقیقی بھائی، میرزا یوسف خاں دیوانہ، بھی مر گیا۔ کیسا پنسن، اور کہاں اس کا ملنا؟ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔ ہے موجزن اک قلزم خوں، آہ" (اردو: ۱۵۶)۔

[۱:۱۶۸] "کیا کہیے، بھلا کہیے، یہ زمین ایک بار یہاں طرح ہوئی تھی۔ مگر بحر اور ہی تھی۔ کہوں جو حال، آہ" (اُردو: ۲۶۸ و عود: ۱۱۱)۔

[۳:۱۶۸] شاکر کے استفسار پر میرزا صاحب نے تحریر کیا ہے:

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب!　　تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے، جیسا کہ اس شعر میں: نہیں ذریعۂ راحت، آہ۔ یعنی: زخم تیر کی تو ہیں، بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے، اور تلوار کے زخم کی تحسین، بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یعنی زائل نہ کیا تنگی کو، پرافشاں، بمعنیِ بیتاب، اور یہ لفظ تیر کے مناسب۔ حاصل یہ کہ تیر تنگیِ دل کی داد کیا دیتا؟ وہ تو خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر، پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا'' (عود:۱۶۱)۔

[۱۷۱:۴] اس کے ساتھ ملاحظہ ہو، ۱۲۸:۳، نیز یہ بیت:

نظارہ کیا حریف ہو، اس برقِ حسن کا جوشِ بہار، جلوہ گر جس کے نقاب ہے

[۱۷۳:۱] اس غزل کے متعلق ۲۲ ر ستمبر ۱۸۶۵ء کو علائی کو تحریر کیا ہے: ''تم نے اشعار جدید مانگے۔ خاطر تمھاری عزیز۔ ایک مطلع، صرف دو مصرعے، آگے کے کہے ہوئے یاد آگئے کہ وہ داخلِ دیوان بھی نہیں۔ ان پر فکر کر کے، ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر، سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں۔

بھائی! کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رُتبہ نہیں...لو، صاحب، تمھارا فرمان قضا تو امان بجالایا، مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں ہے۔ اگر باحتیاط رکھو گے اور اردو کے دیوان کے حاشیے پر چڑھا دو گے، تو اچھا کرو گے'' (اُردو:۳۹۳)۔

عرشی عرض کرتا ہے کہ اردوے معلیٰ میں اس مطلعے کے مصرعوں میں تقدم و تاخر ہے نیز چار شعر مطبوعہ دیوان سے زائد ہیں۔

[۱۷۳:۲] مرزا حاتم علی مہر کے نام کے خط میں، یہ مقطع اور مطلع ثانی:

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے؟ غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے؟

لکھا ہے (ایضاً:۲۸۴)۔

[۱۷۶:۱] علائی کے محولۂ سابق خط میں: ''تاب لائے ہی بنے گی غالب'' کے ساتھ یہ مطلع بھی لکھا ہے۔ (اُردو:۳۹۳)۔

[۱۸۳:۱] یہی مضمون اس شعر میں بھی نظم کیا ہے:

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج، پھر، اس کی روبکاری ہے

[۱۸۳:۲] ملاحظہ ہو، ۱۶۲:۴۔

[۱۸۳:۳] علائی کو لکھتے ہیں: ''اپنا یہ مصرع بار بار پڑھتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی؟ اسباب وآثار سب فراہم ہیں۔ ہاے! الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے: آہ! جی جاؤں، نکل جائے اگر جان کہیں، آہ'' (اُردو: ۴۲۳)۔

تفتہ کو لکھا ہے: ''میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار، سب بھول گیا، مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر، یعنی: ایک مقطع اور ایک مصرع، یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ، گاہ، جب دل الٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری، غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں، تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟'' (ایضاً: ۱۲۴ و عود: ۱۰۰)۔

[۲:۱۸۴] ۵ر ستمبر ۱۸۶۶ء کو سیاح کو تحریر کیا ہے: ''تم برا نہ مانو، کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں، تو اس نے سچ کہا، اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے بُرا کہا، تو اس کو خدا کے حوالے کرو۔ غالب، برا نہ مان، جو دشمن برا کہیں، آہ'' (اُردو: ۲۳)۔

[۳:۱۸۵] ملاحظہ ہو، ۵:۲۳۵۔ یہ شعر بھی اس کا ہم مضمون ہے:

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا نہ مانگ

[۴:۱۸۶] ملاحظہ ہو، ۲:۱۶۰ (فارسی غزل)۔

[۳:۱۸۷] دیکھو یہ ''پر'' کا مخفف ''پہ'' ہے بمعنی لیکن (اردو: ۳۸۶، لاہوری اڈیشن، ۳۷ء)۔

[۱:۱۸۹] ملاحظہ ہو، ۱:۲۴، ۴:۹۳، ۶:۹۰۷۔

~~~~~~~~

اردو مثنوی

[مثنوی درع صفت انبہ] میرزا صاحب نے آم کی تعریف میں جو لطیف تشبیہیں اور پاکیزہ استعارے استعمال کیے ہیں، اُردو ادب میں ان کی مثال ملنا دشوار ہے، مگر ابوالمکارم امیر خاں حسینی ہروی نے فارسی میں ایک مثنوی آموں کی تعریف میں لکھی تھی۔ مناسبت مقام کا تقاضا ہے کہ دس کے چند شعر یہاں ضرور نقل کیے جائیں۔ وہ فرماتے ہیں:
~~~~~~~~

زوصف انبہ، چوں گویم کہ چونست؟ | کہ از رشک شرابش، شہد خونست
ز نامِ او، چو گسیرم لذت قند | زباں با کام، ولب با لب، شود بند
بنختے، ہچو لعل، اما شکر بار | بنرے، چوں طلای دست افشار
بطفلی، چوں دل معشوق، تنگ است | بہ پیری، چوں رخ من، زردرنگ است
زشیریں کاریش، چوں نخل عسل شد | زمرد با زر و یاقوت حل شد
شرابش بہتر از شیر و شکر ہست | گہے ہم رنگ سیم و گاہ زر ہست
بصورت مردم و جایش بر اشجار | کلیم آرزو را شعلۂ نار

(معلوماتُ الآفاق:۴۴،طبع نول کشور پریس،۱۸۷۳ء)

~~~~~~~~

اردو قطعات

(اِس حصے میں شعر کے حوالے کے لیے جو ہندسے استعمال کیے گئے ہیں، ان میں پہلے سے قطعہ نمبر اور دوسری سے شعر مراد ہے)

[۷:۶] ۲۰؍جولائی ۱۸۶۰ء کو تفتہ کے خط میں لکھا ہے: ’’اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدرِ پنجاب سے حکم آ گیا کہ پنسن داران ماہ بہ ماہ نہ پائیں، سال میں دو بار، بطریقِ ششماہہ، فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار، ساہوکر سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا، تارامپور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھے مہینے تک اسی طرح کٹوان دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی؛ رسم ہے مردہ کی چھماہی ایک، آہ‘‘ (اُردو:۷۴)۔

~~~~~~~~

اختلافِ نسخ — فارسی

[اس حصے میں پہلے ہندسے غزل نمبر کو اور دوسرے غزل کی سطر کو ظاہر کرتے ہیں۔]

فارسی متن کے مقابلے اور تصحیح میں، حسبِ ذیل نسخے پیش نظر رہے ہیں۔

آ: دیوانِ فارسی کے انتخاب کا وہ قلمی نسخہ جو میرزا صاحب نے ستمبر ۱۸۶۶ء میں نواب خلد

آشیان (طاب ثراہ) کی خدمت میں نذر گزرانا تھا۔ اس کے صفحات ۹-۵ میرزا صاحب کے اپنے قلم کی مکتوبہ ہیں۔

ب: کلیاتِ فارسی کا وہ قلمی نسخہ جو میرزا صاحب کی طرف سے مارچ ۱۸۶۱ء میں، نواب فردوس مکان (طاب ثراہ) کے حضور میں ڈاک کے ذریعے سے پیش ہوا۔ خود میرزا صاحب کی تصریح کے مطابق، یہ نسخہ نواب فخر الدین خاں مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

ج: کلیاتِ فارسی کا پہلا مطبوعہ نسخہ، جو ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں مطبع دار السلام دہلی میں چھپا؛ اس اڈیشن کی ایک کاپی ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الہ آباد) کے پاس، اور اس اڈیشن کی ایک پرانی نقل کتاب خانۂ عالیۂ رامپور میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں آخری دو صفحے غائب ہیں۔ مگر نسخۂ رامپور کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اشعار کی تعداد ۶۷۲ ہے۔

د: کلیاتِ فارسی کا وہ مطبوعہ نسخہ، جو منشی نول کشور کے اہتمام سے، ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں چھپ کر شائع ہوا، اس نسخے کے خاتمے میں اشعار کی تعداد ۱۰۴۲۴ ظاہر کی گئی ہے۔]

۱:۱۴، آ: تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے برخلاف، آ میں اس جگہ غزلوں کی ترتیب مختلف ہے۔ چوں کہ قرینے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کاتب کی سہو کا نتیجہ ہے، بنا بریں ب، ج وغیرہ کے مطابق، ترتیب غزلیات کو درست کر دیا گیا ہے۔

۹:۱۸، ب، ج، د: ''زحمت عام''۔

۶:۲۰، د: ''کردم''۔

۴:۲۸، د: ''افشانند''۔

۴:۳۸، آ: ''کن'' ندارد۔

۱۰:۳۹، آ: ''دہن ما بزبانِ خط بہ پیمانۂ ما''۔

۱:۴۰، آ: ''اے گل از نقش پائے دامان ترا''۔

۲:۴۰، ب، ج، د: ''کردہ''۔

۳:۴۰، آ: ''تا بخون کہ''۔

۹:۴۰، د: ''چشم''۔

۹:۴۰، آ: ''از یکی''۔

۱:۴۱، آ: ''گزارد مغز جانا را''۔

۸:۴۱، آ: ''خامان را''۔

۱۲:۴۴، آ: ''از رخ''۔

۴۵:۴،آ: ''نم از خم''۔
۴۷:۲،آ: ''گزند تست''۔
۴۷:۳،آ: ''بجبر''۔
۴۸:۹،آ: برآنچہ''۔
۵۶:۵،ب: ''ساختیم''۔
۶۱:۱،ب،ج: ''اگر''۔
۶۴:۲،آ: ''درگماں''۔
۷۸:۴،آ: ''بادہ مینا''۔
۸۰:۴،د: ''آب از رخ''۔
۸۷:۳،آ: ''رماذ'' (بضمِ رائے مہملہ)۔
۹۸:۱۱،سبد چین: کار۔ (یہ شعر دیوان کے کسی نسخے میں موجود نہیں)۔
۱۰۲:۶،ب: ''محیطست گراں ہیچ''۔
۱۰۵:۴،آ: ''گلشت''۔
۱۰۷:۲،آ،ج: ''زہراب''۔
۱۲۷:۵،آ: ''سبکساری''۔
۱۳۷:۱،د: ''خوشہ'' (اس کے بعد والے اڈیشن میں ''خوشا'' ہے)۔
۱۳۷:۵،آ: ''بنوبت بمن''۔
۱۴۱:۴،د: ''خواب ناز''۔
۱۴۷:۷،ب: ''جہنم'' (بضمِ نون)۔
۱۵۰:۱،ب،ج: ''آشنہ''۔
۱۷۱:۳،آ: ''بخنم''۔
۱۷۷:۳،ب: ''میگردی'' (آ میں بھی اسی طرح تھا، لیکن تصحیح کے وقت میرزا صاحب نے گاف کا ایک مرکز چاقو سے چھیل دیا ہے)۔
۱۷۷:۷،ب: ''بالید آشیاں گہ شد''۔
۱۸۷:۱،آ،د: ''بمرگ من یاد آر''۔
۱۷۹:۶،آ: ''سیہ'' ندارد۔
۱۸۵:۱،آ: ''بیاموز'' (صرف ایک جگہ)۔

۱۸۷: ۵، ج، د: ''بیا سودن''۔
۱۸۸: ۲، آ: ''گاہے گاہے''۔
۱۹۰: ۱، ب: ''کاشانہ گزیں''۔
۱۹۸: ۱۰، آ: ''بری''۔
۱۹۹: ۹، آ: ''گر''۔
۲۰۱: ۲، آ: ''جاں را''۔
۲۰۲: ۴، ب، ج، د: ''گر'' (آ میں بھی اسی طرح تھا لیکن ایک مرکز کو میرزا صاحب نے چھیل دیا ہے)۔
۲۰۳: ۲، ب، ج، د: ''کایں'' (آ میں بھی اسی طرح تھا لیکن میرزا صاحب نے ''ی'' کا شوشہ چھیل دیا ہے)۔
۲۱۴: ۳، د: ''بآموزگار ہم'' (آ میں بھی اسی طرح تھا لیکن میرزا صاحب نے ''ہ'' کو چھیل کر اس کی جگہ ''ے'' لکھی ہے)۔
۲۱۷: ۲، آ: ''آزاری من''۔
۲۲۳: ۱، آ: ''گرانہ''۔
۲۲۸: ۱، ب، ج، د: ''روزگاراں''۔
۲۲۸: ۵، ب: ''کدامی''۔
۲۲۸: ۶، آ: ''انتظار داشتم''۔
۲۳۱: ۷ و ۸، یہ شعر کسی قلمی اور مطبوعہ نسخے میں نہیں پایا جاتا۔
۲۳۳: ۴، آ: در حلقۂ کشاکش آہش گرفتہ ایم'' (تمام نسخوں کے مطابق، یہ مصرع غزل کے آٹھویں بیت سے تعلق رکھتا ہے)۔
۲۴۳: ۵، آ، د: ''نازگماں''۔
۲۴۷: ۲، آ: ''گردان''۔
۲۴۷: ۵، آ: ''وتندیشیم''۔
۲۶۶: ۷، آ: ''چنیں'' (دونوں جگہوں پر)
۲۷۱: ۱۰، آ: ''زوریں گماناں''۔
۲۷۳: ۹، آ: ''جحیم''۔
۲۷۶: ۳، آ: ''یارت''۔

۶:۲۷۸، ب: ''طاقت ہفتاد سال''۔

۱:۲۸۳، آ: ''شاہاں''۔

۲:۲۸۹، ب، ج: ''دل گم گشتہ''۔

۵:۲۹۰، آ: ''دور فتت''۔

۸:۲۹۵، آ: ''دہ'' ندارد۔

۵:۲۹۷، آ: ''تو'' ندارد۔

۸:۳۰۲، ب: ''خلخ'' (بفتح لام مشدد)۔

۵:۳۰۳، آ، ب: ''گوئی'' و آ: ''نشوی''۔

۴:۳۱۱، ب، ج: ''باہم''۔

[اس حصے میں پہلے ہندسے رباعی نمبر کو اور دوسرے رباعی کی سطر کو ظاہر کرتے ہیں۔]

۳:۳، آ: ''درجلوہ''۔

۸، ب، ج: ''رباعی'' ۸، ندارد۔

۳:۱۵، ب: ''لطف وگرمی''۔

۲:۱۷، ب: ''درزلف''۔

~~~~~~~~

اختلافِ نسخ — اُردو

اُردو متن کے مقابلے اور تصحیح میں، حسبِ ذیل آٹھ نسخوں سے مدد لی گئی ہے:

آ: دیوانِ اُردو کے انتخاب کا وہ نسخہ، جو ستمبر ۱۸۶۶ء میں، میرزا صاحب نے نواب خلد آشیان (طاب ثراہ) کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا۔ اس کے صفحات: ۶، ۱۲، ۱۴ وغیرہ پر میرزا صاحب کے قلم کی اصلاحی پائی جاتی ہیں۔

ب: دیوانِ اُردو کا وہ قلمی نسخہ، جسے میرزا صاحب نے مئی ۱۸۵۷ء میں نواب فردوس مکان (طاب ثراہ) کے حضور میں بذریعۂ ڈاک ارسال کیا تھا۔ اس کے آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر کی تقریظ بھی شامل ہے، جو دراصل ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۹ء) میں لکھی گئی تھی؛ لیکن زیرِ نظر نسخے میں اس
~~~~~~~~

کی تاریخ بدل کر ۱۲۷۱ھ بنادی گئی ہے، اس تقریظ کے مطابق، اشعار کی تعداد ۱۰۹۹ اور کچھ ہے۔ اس نسخے میں بھی میرزا صاحب کے قلم کی اصلاحیں موجود ہیں۔

ج: دیوانِ اُردو کا وہ مطبوعہ نسخہ جو شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں، سید محمد خان بہادر کے چھاپے خانے، واقع شہر دہلی، میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں بھی مذکورہ بالا تقریظ ہے؛ لیکن اس کی تاریخ تحریر ۱۲۵۴ھ اور تعدادِ اشعار ۱۰۹۸ ہے۔ اس اڈیشن کی ایک کاپی پبلک لائبریری، رامپور، میں اور اس کی پرانی قلمی نقل، جس میں ناقل نے سرورق کی عبارت بھی نقل کی ہے، کتاب خانہ سرکاری میں موجود ہے۔

د: دیوانِ اُردو کا وہ نسخہ جو مئی ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مطبع دارالسلام دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے آخر میں بھی مذکورۂ بالا تقریظ شامل ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ تعدادِ اشعار ''یک ہزار و یک صد و اند'' بنادی گئی ہے۔

اس اڈیشن کی ایک کاپی یونیورسٹی لائبریری، دہلی میں محفوظ ہے۔ آج کل اس کی نقل کتاب خانہ عالیہ رامپور کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ اس نسخے کا ۱۵ سطری مسطر اور تعدادِ صفحات ۹۸ ہے۔ ہاں، زیرِ نظر نسخے میں صفحات ۵-۸ ندارد ہیں۔

ہ: دیوانِ اُردو کا وہ نسخہ، جو ۲۰ رمحرم ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو دہلی کے مطبع احمدی میں، باہتمام اموجان طبع ہوا۔ اس کے آخر میں میرزا صاحب کی ایک تحریر بہ عنوان ''عبارت خاتمۂ دیوان'' چھپی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اس کی کاپیوں کی خود تصحیح کی تھی، لیکن لفظ ''کسی'' کی جگہ ''کسو'' کاتب نے اتنے مقامات پر لکھ دیا تھا کہ آخر تھک کر میرزا صاحب نے اسے علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا۔

و: دیوانِ اُردو کا وہ نسخہ، جو نسخۂ د سے ذی حجہ ۱۲۷۸ھ میں کانپور کے مطبع نظامی میں چھپا۔ نسخہ آ دراصل اسے اسی سے نقل کیا گیا ہے۔

ز: دیوانِ اُردو کا وہ نسخہ، جو منشی شیونرائن نے اپنے مطبع مفید خلائق، آگرہ میں ۱۸۶۳ء میں

چھاپ کر شائع کیا۔ اس نسخے کی ترتیب نسخۂ ب کے مطابق ہے۔

ح: دیوانِ اُردو کا وہ نسخہ، جو نظامی پریس، بدایوں، سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اس نسخے کی تصحیح میں نسخۂ ب سے مدد لی گئی ہے۔]

[اس حصے میں پہلے ہند سے غزل نمبر کو اور دوسرے غزل کی سطر کو ظاہر کرتے ہیں۔]

۲:۶، ج، ہ، و: ''ایک''۔

۴:۶، ہ: ''ہر ایک قطرۂ خوں'' (میرزا صاحب نے نواب فردوس مکاں، ناظم کے مصرع: ''یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک'' میں ''ہر یک'' بنا کر لکھا ہے: ''جہاں 'ہر ایک' اچھی طرح نہ آئے، وہاں 'ہر یک' لکھیے، 'ہر ایک' کیوں لکھیے۔ نیز پچیسویں غزل کے تیسرے شعر میں کاتب نے ''ہر ایک'' لکھا تھا۔ اسے خود میرزا صاحب نے الف کاٹ کر ''ہر یک'' بنایا ہے)۔

۲:۱۰، آ، و: ''ہر ایک''۔ ب، ج، ہ: ''ہر یک''۔ ز، ح: ''ہر اک''۔

۱۰:۱۰، آ ج، ج، د، ہ، و: ''ایک''۔ ب، ز: ''اِک''۔ (میرزا صاحب نے نواب فردوس مکان، ناظم کے مصرع: ''رکھتے ہیں ابھی اک دل ہنگامہ گزیں ہم'' کے مقابل حاشیہ پر لکھا ہے: ''یہاں 'ایک' کی جگہ 'اک' درست ہے، مگر 'ہر' کے ساتھ 'ہر یک' ہو، نہ 'ہر اک')۔

۴:۱۱، آ: ''جاندادۂ جاں ہوائی''۔

۲:۱۳، ب، ج، د، ہ: ''یک دیوان''۔

۲:۱۱۲، ح: ''بھرنے تلک''۔

۹:۱۷، آ، و: ''خونناب'' (اسی طرح آ اور و میں ہر جگہ پایا جاتا ہے)۔

۳:۱۸، آ، ب، د، ہ: ''نگہت''۔

۵:۱۹، ب: ''سب کے ہے دل میں جگہ''۔

۹:۲۰، ب، ہ: ''تنہا''۔ ز: ''تھا''۔

۴:۲۱، آ، و: ''اوس کی''۔

۲:۲۵، آ: ''ڈویا''۔

۲۰:۴، آ، و، ز: ''خورشید''۔ (میرزا صاحب نے ایک مکتوب میں صراحت کردی ہے کہ لفظ ''خور'' کو تنہا ''خور'' اور باضافہ ''شید'' ''خرشید'' لکھنا چاہیے۔ اس لیے ہر جگہ بحذف و لکھا گیا ہے)۔
۳۲:۱، آ: ''آینہ''۔
۳۳:۴، ب، د، ز: ''دست و خنجر قاتل''۔
۳۵:۱۰، آ، و: ''ننگ سجدے سے''۔
۴۱:۱، ہ: ''دیداں''۔ (آ میں بھی اسی طرح تھا، لیکن میرزا صاحب نے اپنے قلم سے درست کردیا ہے)۔
۴۹:۱۰، آ: ''بادۂ ساغر''۔
۵۰:۷، آ: ''آب'' ندارد۔
۵۲:۱، آ: ''اور''۔ (ہر جگہ بضمۂ الف لکھا ہے)۔
۵۲:۲، آ: ''کماں اور''۔
۶۰:۲، ح: ''ہونے تک''۔ (اسی طرح تمام جدید الطبع نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ جدید محاورہ ہے۔ پرانا محاورہ وہی ہے، جو تمام قدیم قلمی و مطبوعہ نسخوں میں لکھا گیا ہے۔)
۶۲:۱، د: ''پیش''۔
۶۶:۶، ب، ج، د، ہ: ''ذرّہ''۔
۶۷:۲، و: ''گراک''۔
۷۰:۲، آ: ''مجھمر''۔
۷۰:۴، د: ''پای طلب''۔
۷۱:۲، آ، ہ، و: ''میری پانوں''۔ ز: ''پاوں''۔
۷۵:۱، ب، د، ہ: ''یک قد آدم''۔
۷۸:۲، ب، ہ: ''ہر یک''۔
۸۰:۵، د: بوسعت''۔
۸۰:۸، آ: ''جای رہیں''۔
۸۱:۲، آ: ''مضموں کو''۔
۹۰:۱۱، ب، ز: ''اور کو آزمائے کیوں''۔
۹۱:۴، ب، ج، د، ہ: ''آوے وہ یہاں''۔ ز: ''آئے وہ یہاں''۔
۹۳:۶، ب، ز: ''ٹھیڑا''۔ ہ: ''ٹھیرا''۔
۹۵:۱۳، آ، د، ہ؟ ''وہاں''۔ (میرزا صاحب نے اصل میں اپنے قلم سے ''واں'' بنایا ہے؛ اس لیے ہر

جگہ بحذف ''ہ'' لکھا گیا ہے، لیکن قبل ازیں، نواب فردوس مکاں، ناظم کے مصرع: ''سیاح جہاں گرد ہیں، آ نکلے یہاں بھی'' پر لکھا ہے: ''یہاں، بروزن وہاں فصیح نہیں۔ بے ضرورت نہ چاہیے۔ ''یہاں، بہ یای مخلط التلفظ افصح ہے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں انھوں نے املا میں ترمیم کرلی تھی۔)

۱۰۱: ۷، ب، ہ: ''شہرا''۔

۱۰۲: ۲، آ: ''آنکھوں''۔ ج: ''بھو''۔

۱۰۵: ۱، آ: ''تھا''۔

۱۰۸: ۱، د: ''ستمزدگوں''۔

۱۰۸: ۴، ب، ج، د، ہ، و: ''ذرہ''۔ ز: ''ذرے'' (آ میں بھی ذرہ لکھا تھا، لیکن میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''ہ'' کی جگہ ''ی'' لکھی ہے۔)

۱۰۹: ۱، د: ''برشگال''۔

۱۱۰: ۲، ب: ''تسکیں کو نوید''۔ (ہ میں بھی اسی طرح لکھا تھا، لیکن غالباً کاپی کی تصحیح کے وقت میرزا صاحب نے لفظ ''دے'' کے سطر کے اوپر اضافہ کرایا ہے۔)

۱۱۷: ۶، آ، ب، ج، د، ہ: ''نگہت''۔

۱۱۸: ۸، آ، ہ، و: ''سینکڑوں''۔

۱۱۹: ۶، آ: ''ترے''۔

۱۲۱: ۳، ب، ہ، و، ز: ''اپنا نہیں وہ شیوہ''۔ (آ میں بھی اسی طرح تھا۔ میرزا صاحب نے اپنے قلم سے یہ تغیر کیا ہے۔)

۱۲۷: ۶، آ: ''اس''۔

۱۲۸: ۲، د: ''دونو''۔

۱۳۳: ۱۰، ب: ''فردوس ہوش ہے''۔

۱۳۳: ۱۳، آ: ''نہ وہ سرور نہ سوز''۔ و: ''سرور و سوز''۔

۱۳۷: ۹، ب: ''دل ناداں''۔

۱۳۸: ۷، ب، ز: ''رونق منہ پر''۔

۱۳۹: ۳، ج: ''یعنی''۔ (بعض مطبوعہ نسخوں میں ''بنی'' لکھا ہے۔)

۱۴۲: ۹، آ: ''نہیں'' ندارد۔

۱۴۷: ۲، د: ''خونابہ''۔

۱۴۹: ۲، آ: ''آئی''۔

۱۵۱:۱،ب،د،ہ،ز: ''مجھسے''۔(ہر ردیف اسی طرح ہے۔)
۱۵۱:۴،ب،ج،د: ''دود کی طرح''۔(ہ میں بھی اسی طرح تھا،لیکن صحت نامے میں ''صورتِ دود'' بنایا گیا ہے۔)
۱۶۱:۶،آ: ''کئے''۔ہ،و: ''ہی''۔
۱۶۵:۱،ب،د،ہ،ز: ''مجھسے''۔(ہر ردیف اسی طرح ہے۔)
۱۶۶:۴،ب،ہ،و: ''شانہ''۔(آ میں بھی اسی طرح تھا،لیکن میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''شانے'' بنایا ہے۔)
۱۶۸:۱۲،آ،و: ''کہیں''۔
۱۶۹:۲،آ: ''دھونے گئے''۔
۱۷۱:۲،ب،د،ہ،وہ،،ز: ''تجھسے''۔
۱۷۶:۶،ب، ''کوچہ''۔
۱۸۱:۲،آ،د،ہ: ''میری''۔د: ''بیجان' کی''۔
۱۸۳:۴،آ،ب،د،ہ،و: ''یہاں''۔
۱۸۶:۵،ہ: ''گر''۔(آ میں بھی اسی طرح تھا۔میرزا صاحب نے اصلاح کردی ہے۔)

[اس حصے میں پہلے ہندسے قصیدہ نمبر کو اور دوسرے قصیدے کی سطر کو ظاہر کرتے ہیں۔]

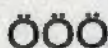
۱:۱،ج: ''منتخب قصیدۂ منقبت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ''۔د: ''افزایش آبروی گوہر سخن بہ ثنای ابر الایمہ حضرت علی مرتضیٰ علی التحیۃ والثنا''(عنوان قصیدہ ۱)۔
۲:۱،ج: ''انتخاب قصیدۂ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام''۔د: ''ایضاً فی المنقبۃ''(عنوان قصیدہ ۲)۔
۲:۱۱،آ: ''ہو''۔
۲:۱۴،آ: ''ترا''۔
۴:۱۳،ب،ز: ''دکھادوں گا''۔
۴:۳۳،ب،ج،ہ،و: خامہ نے پائی طبیعت سے مدد''۔(آ میں بھی اسی طرح تھا،لیکن میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ترمیم کی ہے۔)
۴:۳۴،ح: ''بادباں کے اٹھتے ہی''۔

[اس حصے میں پہلے ہند سے قطع نمبر کو اور دوسرے قطعے کی سطر کو ظاہر کرتے ہیں۔]

۱:۲، آ: ''بے شبہ عدیل''۔
۱:۱۵، آ: ''تری''۔
۱:۲۰، آ، ہ، و، ح: ''چاہا''۔
۱:۲۶، آ، و، ز، ح: ''امر''۔ب: ''ہ''۔ز: ''عمر''۔
۲:۱، ج، د: ''قطعہ در نمایش عنوان دلآوازی گفتار، وآسان کردن اندوہ پشیمانی بر دل دلدار''۔(یہ دوسرے قطعے کا عنوان ہے۔د میں ''بر نمایش'' ہے۔)
۶:۱۵، و، ح: ''تو''۔(آ میں بھی اسی طرح تھا۔میرزا صاحب نے اپنے قلم سے ''تو'' کاٹ کر ''کہ'' بنایا ہے۔)
۶:۱۱، آ: ''مری''۔

~~~~~~~~
~~~~~~~~

اشاریہ



ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

ISBN : 81-7160-150-2